عصرِ حاضر کی شخصیات

میری نظر میں

(حصہ دوم)

محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۴۰۰- بی لطیف آباد نمبر۴، حیدرآباد

کتاب کا نام: عصرِ حاضر کی شخصیتیں- میری نظر میں

(حصہ دوم)

مصنف: محمد موسیٰ بھٹو

کمپوزنگ: مقصود احمد بھٹو

کمپوزرس: اسلامک کمپیوٹر کمپوزرس

۴۰۰- بی- لطیف آباد نمبر۴ حیدرآباد

قیمت: ۲۰۰ روپے

اشاعت: مارچ ۲۰۱۶ء

پریس: یادگار پرنٹنگ پریس، حیدرآباد

ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد

انتساب

عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب کے نام
جو اس عاجز سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے دعوتی و
اشاعتی کاموں میں اپنے حصہ کا بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' (حصہ دوم) یہ پہلے حصہ کا تسلسل ہے، اس موضوع پر ہماری پہلی کتاب ''گلدستہ'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ جسے ۲۰۰۶ء میں کافی نئی شخصیتوں کا تعارفی خاکہ شامل کرکے مذکورہ نام سے شایع کیا گیا تھا۔

حصہ دوم میں شامل زیادہ تر نئی شخصیتیں ہیں، تاہم کچھ وہ شخصیتیں بھی ہیں، جن کا ذکر حصہ اول میں موجود ہے، لیکن اس میں شامل مواد حصہ اول سے کافی مختلف ہے، ان شخصیتوں کا نیا تعارفی خاکہ ان کے انتقال کے موقع پر ''بیداری'' کے لئے لکھا گیا تھا، جسے اب کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

کافی عرصہ سے ہم سے حسن ظن رکھنے والے بعض دوستوں کا تقاضہ تھا کہ اپنے حالات زندگی جس میں زندگی کے تجربات ومشاہدات شامل ہوں، پر کتاب لکھیں، اس عاجز نے اس پر کافی غور وفکر کیا، جس سے معلوم ہوا کہ ہمارے حالاتِ زندگی اس قابل ہی نہیں ہیں کہ انہیں پیش کیا جائے۔ یہ کوئی عجز وانکساری کی بات نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے، تاہم دوستوں کا اصرار جاری رہا، اس کی صورت اس عاجز کو یہی نظر آئی کہ جن شخصیات سے ہمارا تعلق رہا ہے، اس تعلق کے حوالے سے اپنے جو بھی تجربات ومشاہدات ہوں، انہیں پیش کیا جائے، اس سلسلہ میں زیر کتاب میں شامل بعض شخصیتوں کے حوالے سے کسی حد تک ہمارے اپنے حالات بھی آگئے ہیں، اس موضوع پر زیادہ تفصیل ہماری سندھی کتاب ''جدید سندھ کے عالم ودانشور'' میں شامل ہے، جس کا اردو ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ اردو میں اس نام سے جو کتاب ہے، وہ سندھی کتاب کا جزوی حصہ ہے۔

زیر نظر کتاب میں بعض اہم علمی شخصیتوں کے کام، فکر اور حکمت عملی کو سمجھنے کی بھی کاوش ہوئی ہے۔ اور ان کے فکر ونظر وحکمت عملی پر تنقید بھی آ گئی ہے، اس تنقید کی حیثیت خود احتسابی ہی کی ہے، اس لئے کہ یہ شخصیتیں ہمارا اپنا ہی سرمایہ ہیں۔ اور وہ گویا اپنے ہی وجود کا حصہ ہیں۔ اپنی شخصیت پر تنقید کا مقصد اصلاح ہی ہوتا ہے۔

کتاب میں شامل بعض شخصیتیں وہ ہیں، جو اس عاجز کے لئے مربی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کی پاکیزہ سیرت وکردار کو اجاگر کرنے کے لئے ان کے حالات زندگی کے اہم گوشے بیان ہوئے ہیں۔

۲ فروری ۲۰۱۶ء

محمد موسیٰ بھٹو

حیدرآباد

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

مولانا علی میاں کی فکر پر ہمارا تفصیلی مضمون ''اسلامی فکر بیسویں صدی میں'' کتاب میں موجود ہے۔ ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' کتاب میں بھی مولانا کے بارے میں کچھ مواد شامل ہے۔

اس مضمون میں اپنی یادوں اور تاثرات کے حوالے سے کچھ ذکر ہوگا۔

میری ذہنی اور فکری نشوونما مولانا مودودی کی فکر کے ماحول میں ہوئی تھی، میں نے ۱۵ سال کی عمر میں مولانا مودودی کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' کی برسوں کی قارئیں پڑھ لی تھیں، پھر برسوں تک مولانا مودودی کی کتابوں کا مطالعہ ہوتا رہا۔ مجھے جو ماحول ملا تھا، وہ یہی تھا۔ ہمارے عزیز مولانا جان محمد بھٹو صاحب، جن کی زندگی اہل اللہ کا مثالی نمونہ تھی، جن کا پاکیزہ کردار اور سیرت کی بلندی دیکھکر سلف کی یادیں تازہ ہوتی ہیں، وہ سندھی آبادی میں جماعت اسلامی کی اصل اور اس کے روح رواں تھا، انہوں نے میرے مطالعہ کا ذوق دیکھکر مولانا مودودی کی اپنی بیشتر کتابیں مجھے ہدیتہً دیدی تھیں۔ اگرچہ مولانا مودودی کا فکر میرے تحت الشعور کا حصہ بن چکا تھا، لیکن دل میں کھٹکہ ضرور موجود تھا، دل کا یہ کھٹکہ یا عدم تشفی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ ۱۹۶۹ء، کے آخر میں جب کہ میری عمر ۲۷ سال کے لگ بھگ تھی، مجھے جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے مرکز حیدرآباد میں نشرواشاعت میں ناظم کی حیثیت سے متعین کیا گیا۔ مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب، جو جماعت اسلامی سندھ کے سیکریٹری جنرل تھے، انہوں نے میری خفتہ صحافیانہ صلاحیتوں کو دیکھکر انہیں اجاگر کرنے اور میری صحافیانہ تربیت میں کردار ادا کیا، مولانا ندوی صاحب، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے شاگرد تھے، لیکن موصوف اپنے استاد کی فکر کے مقابلہ میں مولانا مودودی کی فکر کو صحیح اور کامل فکر سمجھتے تھے۔

۱۹۷۰ء کی ابتدا شروع سے حیدرآباد شہر سے سندھی زبان میں ''الوحید'' کے نام سے اخبار نکلنا شروع ہوا، جس کے مدیر سندھ کے ظفر علی خان مولانا خیر محمد نظامانی مقرر ہوئے، مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب نے مجھے اس بات پر قائل کیا کہ میں ''الوحید'' میں کالم نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے کام شروع کروں۔ اس سے میری صلاحیتیں بیدار ہوں گی، چنانچہ میں ''الوحید'' سے وابستہ ہوگیا۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن کے دوران ملک بھر میں یہ فضا تھی کہ جماعت اسلامی ملک کی سب سے زیادہ نہیں تو دوسرے نمبر کی سیاسی طاقت کی حیثیت سے سامنے آئے گی، لیکن انتخابات میں جماعت کو قومی اسمبلی میں کل چار سیٹیں ملیں۔ اس ناکامی کی وجہ سے جماعت اسلامی کے بہت سارے کام متاثر ہوئے ''الوحید اخبار'' بھی دوچار ماہ کے دوران بند ہوگیا۔

اس کے بعد میں نے روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں اردو میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ جلد ہی وقائع نگار خصوصی کی حیثیت سے میرا اس میں تقرر ہوگیا، اب مجھے قومی اخبار میں زیادہ سے زیادہ مضامین لکھنا پڑے، اس کے لئے مطالعہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مولانا سید ابو الحسن ندوی، جو مولانا مودودی کے ساتھ ہی مفکر اسلام کی حیثیت سے متعارف تھے، ان کی کتابوں کا مطالعہ شروع ہوا، یہ ۱۹۷۱ء کے آخر کی بات ہے۔ ''مجلس نشریات اسلام'' کی طرف سے مولانا کی کتابیں شایع ہورہی تھیں، اس وقت تک مولانا کی جتنی کتابیں چھپ چکی تھیں، وہ میں نے لے کر پڑھنا شروع کیں۔ ایک بار نہیں، کئی کئی بار پڑھیں۔ مولانا کی کتابوں کے مطالعہ سے جہاں میری معلومات میں اضافہ ہوتا رہا اور عصر حاضر کے چیلنج کو سمجھنے میں مدد ملی، وہاں مولانا کی تحریر سے یہ احساس بھی پیدا ہوتا رہا کہ اس تحریر میں کوئی ایسی چیز ضرور موجود ہے، جو اس دور کے دوسرے مصنفوں کی تحریر میں عام طور پر نظر نہیں آتی، اس طرح مولانا کی تحریروں نے دل کو متاثر کرنا شروع کیا۔

اب مولانا مودودی کی اقامت دین اور غلبہ دین کی نصب العینی فکر کے بارے میں میرے اشکالات میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرا اشکال یہ تھا کہ کیا اقامت دین کی

جدوجہد، دین کا نصب العین نہیں ہے، اگر نہیں ہے تو دین کا اصل نصب العین کیا ہے اور اس نصب العین کے حصول کا طریقہ وذریعہ کیا ہے، چونکہ مولانا علی میاں کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت میری زیادہ نیت معلومات میں اضافہ اور تحریر میں بہتر سے بہتر الفاظ اور جملوں کا حصول تھا۔ اس نیت کے باوجود مولانا کی تحریروں میں موجود باطنی قوت اور عشق کی چنگاری متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی اور مولانا مودودی کی فکر پر عدم اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس اضافہ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرا ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۵ء تک قیام ورہائش جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے دفتر میں تھی، جماعت کی صوبائی اور مرکزی قیادت کو اس عرصہ میں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

یہ دیکھکر ملال ہوتا تھا کہ اصلاح نفس، فکر آخرت، کردار وسیرت میں پاکیزگی کی فکر، تعلق باللہ اور ذکر واذکار کی بجائے ساری سرگرمیوں، ساری جدوجہد اور شب وروز ہونے والی ساری گفتگو کا محور سیاست، سیاسی تجزیے وتبصرے اور اخبارات میں شائع ہونے والے بیانات یا وقتی نوعیت کے سیاسی واقعات ہی ہوتے تھے۔

مولانا علی میاں نے بھی اپنی کتاب ''کاروان زندگی'' میں ابتدائی دور میں جماعت اسلامی لکھنو کے امیر کی حیثیت سے تین سال تک کام کرتے رہنے سے جماعت سے وابستہ افراد کے مزاج کے بارے میں ایک نکتہ جو لکھا ہے ''وہ یہی ہے۔ لکھتے ہیں: ایک بات یہ کہ ان میں دین کے ذوق وعمل میں کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔ **(صفحہ ۲۴۴، جلد اول)**

ان حالات میں تحت الشعور سے جو فکری رجحانات ابھرتے تھے، وہ اقامت دین کی جدوجہد ہی کے حوالے سے تھے کہ دین میں اصل حیثیت اس جدوجہد کی ہے یا اصلاح نفس اور تعلق مع اللہ کی۔

اس اشکال کو دور کرنے کے لئے مجھے برسوں تک مطالعہ کرنا پڑا۔ مولانا ندوی کی کتابوں کا مطالعہ تو میں بڑی حد تک کر چکا تھا۔ اس نے میرے تعطل وجمود کو دور کرکے، اس سلسلہ میں مجھے مضطرب کردیا اور دل میں طلب پیدا کی۔ دین کی صحیح

ترتیب اور اس کے نصب العینی فکر اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کے سلسلہ میں مجھے بیسویں صدی کے مفکروں اور اچھے لکھنے والوں تقریبا سب کو پڑھنا پڑا۔

اس وسیع مطالعہ میں مجھے جس شخصیت نے زیادہ متاثر کیا اور میرے اشکالات کو دور کیا، وہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب تھے، اس وقت ڈاکٹر صاحب کی کتابیں بہت کم دستیاب تھیں۔ بہرحال میں نے کوشش کرکے، ان کی ساری کتابیں کہیں نہ کہیں سے حاصل کرلی۔ بعض کتابیں اصل نہ ملی تو ان کی فوٹو اسٹیٹ کرالی۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ بندہ مؤمن کا سب سے پہلا ہدف اس کی اپنی ذات اور اس کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات اپنی شخصیت اور اپنے نفس کو اللہ ورسول کا مطیع کئے بغیر دعوت دین اور باطل کے خلاف صف آرائی کے کام کا اہل ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ اپنی شخصیت اور نفسی قوتوں کے طلسم کا شکار ہوجائے گا اور اس کی ساری جدوجہد میں نفسی آمیزشیں شامل ہوں گی۔ اس لئے سب سے پہلے نفس کے خلاف مجاہدہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر بندہ مومن کے کام کا دوسرا مرحلہ شروع ہی نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے مزید لکھا کہ نفس کے خلاف مجاہدہ کا اصل ہتھیار ذکر وفکر ہی ہے، ذکر وفکر کی کثرت سے قلب میں وہ نور پیدا ہوگا، جو نفسی قوتوں کی شہ زوری اور سرکشی کو توڑ کر، فرد کو اللہ کا مخلص اور وفادار بندہ بنادے گا اور اس کی سیرت کو پاکیزہ بنادے گا اور ذکر وفکر کی یہ سعادت اہل اللہ کے فیض نظر سے ہی حاصل ہوگی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے اشعار بھی دیئے۔

فرد کے پاس خرد کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ڈاکٹر صاحب نے مزید لکھا کہ کثرت ذکر وفکر کے ذریعہ فرد میں جو باطنی قوتیں پیدا ہوں گی، یہ باطنی قوتیں ہی اسلامی دعوت کے فروغ اور باطل کے مقابلہ کے لئے صرف ہوں گی۔ دین کی صحیح ترتیب یہی ہے۔

اگرچہ مولانا علی میاں کی فکر بھی یہی ہے، اور ان کے اصل فکری خطوط بھی یہی ہیں، لیکن ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے جس سلیقہ اور زور بیان سے اس نکتہ کو واضح

کیا، اس نے میری زندگی کے رخ کو تبدیل کیا اور اہل اللہ سے رجوع ہوکر ذکر وفکر کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا۔

اگرچہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے فکر کے بعض اجزا سے اتفاق ہونا مشکل ہے، مثلا نظریہ ارتقا پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اگرچہ انہوں نے اس وقت کے جدیدیت سے متاثر افراد کی طمانیت کے لئے لکھا ہے، لیکن جدید تحقیق نے ارتقا کی اس تدریج کو بالکل غلط ثابت کردیا ہے، اس لئے موجودہ حالات میں ارتقا کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے بحث کا بڑا حصہ غیرضروری اور عدم افادیت کا حامل نظر آتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں انہوں نے جو بحث کی ہے، وہ کمیونزم کے معاشی نظام کے تقابلی تجزیہ کے پس منظر میں کی ہے اور معاشی مساوات کو انہوں نے اسلام کا بنیادی معاشی نظریہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں معاشی مساوات کو ایمان کے ارتقاء کا نتیجہ تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اسے اسلام کے معاشی نظام کا بنیادی حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح غلامی کے مسئلہ پر بھی ان کے ہاں جدیدیت سے مرعوبیت پائی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی مفکروں اور فلاسفروں کے ہاں اصل دیکھنے کی جو چیز ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی فکر سے بحیثیت مجموعی اسلامی فکر کو تقویت ملتی ہے اور اس میں اسلامی فکر کی نصب العینی حیثیت اور اس کی ترتیب میں سلف صالحین کی اسلامی فکر سے مماثلت پائی جاتی ہے، یا نہیں۔ اگر فکر کے بنیادی خطوط صحیح ہیں تو بعض معاملات میں فکر کی اجتہادی غلطیاں ایسی ہیں، جو قابل معافی ہیں۔

مولانا علی میاں اس اعتبار سے ڈاکٹر رفیع الدین کی فکر کے قائل ہیں۔ موصوف نے جدید دور میں ارتداد کی ہمہ گیر لہر کے موضوع پر ۱۹۵۸ء میں ایک تفصیلی مضمون لکھا، وہ مولانا کے انتہائی مضامیں میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں مولانا نے اپنی ایک کتاب ''کاروان زندگی'' میں توضیح کی ہے کہ اس مضمون لکھنے کا خیال انہیں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ایک مضمون سے آیا۔ یہاں اس سلسلہ میں مولانا کا تفصیلی حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔

’’ میں ہمارے دوست سعید رمضان جو ’’المسلمون‘‘ رسالہ دمشق سے نکال رہے تھے، ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے جرمنی چلے گئے، انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ ان کی غیرموجودگی میں ’’المسلمون‘‘ کا اداریہ میں لکھدیا کروں، میں نے کئی مہینے اس کی تعمیل کی، اس سلسلہ میں میرا پہلا مضمون ’’ردۃ جدیدۃ‘‘ کے عنوان سے تھا، جس میں میں نے عالم اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشاندہی کی، یہ وہ ارتداد ہے، جو مشرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی وتہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے اور سب سے عظیم ارتداد ہے، جو عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے، یہ دینِ لادینیت ہے، جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے بے شمار افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے، لیکن پچھلی ارتدادی تحریکوں اور لہروں کے برخلاف اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریاتِ دین اور حقائقِ دینی کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلی مذہب کا خود اعلان کرتا ہے اور نہ اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور اس سے فصل وانقطاع کا وہ معاملہ کرتا ہے، جو مرتدین سابقین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

درحقیقت اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلہ کی طرف توجہ فاضلِ گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی، میں نے یہ بنیادی تصور لے کر اس کو اس مضمون میں شرح وبسط کے ساتھ لکھا، لادینیت کی عالمگیر اشاعت کا راز بھی بتایا، عالم اسلام میں اس کے اہم مظاہر کی بھی نقاب کشائی کی، پھر اس کے علاج کے طریقے، نئی طاقتور دعوت ایمان اور اس کے لئے نئے علمی اداروں کی ضرورت، نئے ذہن کو سامنے رکھ کر طاقتور لٹریچر کی تیاری پر زور دیا، اور اس سنگین صورتِ حال کی تصویر کشی کی، جس سے عالمِ اسلام دوچار ہے۔

یہ مضمون دوقسطوں میں ’ردۃ جدیدۃ‘ اور ’دعوۃ جدیدۃ‘ کے عنوان سے ’المسلمون‘ میں شائع ہوا، بعد میں یہی ایک مستقل رسالہ کی شکل ’’ردۃ ولا ابا بکرؓ لھا‘‘ (فتنۂ

ارتداد ہے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ابوبکرؓ نہیں) کے عنوان سے شائع ہوا، جو مختلف وقتوں میں اور مختلف اداروں کی طرف سے ہزاروں ہزار کی تعداد میں طبع ہوا اور منیٰ وعرفات تک میں اس کی تقسیم ہوئی، غالبا راقم کا کوئی مضمون، رسالہ، یا کتاب اتنی بڑی تعداد میں نہ شائع ہوئی نہ اثر انداز، اردو میں اس کا ترجمہ مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب مدیر ’’الفرقان‘‘ کے قلم سے ’’نیا طوفان اور اس کا مقابلہ‘‘ کے عنوان سے پہلے ’’الفرقان‘‘ پھر رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہوا۔‘‘ **(کاروان زندگی جلد اول صفحہ۴۵۲۔۴۵۳)**

مولانا نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے جس مضمون کا ذکر فرمایا ہے ان کا وہ مضمون ان کی کتاب ’’قرآن وعلم جدید‘‘ کے آغاز میں شامل ہے، اور منفرد نوعیت کا مضمون ہے، مولانا علی میاں سے ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی خط وکتابت بھی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی فکر جدید تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد کو اسلام کے قریب لانے میں جو کردار ادا کرسکتی ہے، اس کا اندازہ مشہور محقق اور اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کی بیان کردہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ میں زندگی بھر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی فکر کی سحر سے باہر نہ نکل سکا۔

دعوۃ اکیڈمی کے سابق سربراہ عبدالجبار شاکر صاحب (جو وسیع مطالعہ کی حامل شخصیت تھے) ان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر رفیع الدین کی کتاب ’’آئیڈیا لوجی آف دی فیوچر‘‘ ایسی کتاب ہے، جو بیسویں صدی کی اسلامی کتب پر بھاری کتاب ہے۔ سارے مفکروں کی تحریریں ایک طرف اور ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب ایک طرف۔

مولانا علی میاں کے ذکر میں، میں ڈاکٹر رفیع الدین کی فکر کی تفصیل میں چلا گیا۔

اس دور میں مولانا علی میاں کی شخصیت اور ان کی فکر میرے لئے کئی اعتبار سے آئیڈیل ہے، ایک تو مولانا کی تقویٰ، عاجزی، منکسر المزاجی، دوم مولانا کی بے پناہ

دعوتی وعلمی خدمات، سوم مولانا کی وسعت ظرفی اور دنیا بھر میں دین کے لئے ہونے والے سارے کام کو اپنا کام سمجھنے کے مزاج کا حامل ہونا۔

لیکن مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت جو مولانا کی شخصیت کا امتیازی نشان ہے، اور جس کی وجہ سے اس عاجز کی نظر میں مولانا، اس دور میں اسلام کے سب سے بڑے متوازن ترجمان اور عظیم وبے مثال داعی نظر آتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کی فکر کے بنیادی خطوط سے لے کر اس کے سارے جزوی پہلوؤں کی پیشکش تک میں مولانا کے ہاں کمال درجہ کا توازن واعتدال پایا جاتا ہے۔ کہیں بھی سلف سے جداگانہ موقف نہیں۔ جدید مسائل میں قرآن وسنت پر غوروفکر کے نتیجہ میں متوازن فکری وعلمی رہنمائی کا بہتر انتظام موجود ہے۔

مولانا کی فکر کے مطالعہ سے جہاں سلف صالحین کے قرآن وسنت کے تسلسل سے رشتہ مستحکم ہوتا ہے،وہاں جدیدیت کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی پوری طرح ابھرتی ہے۔ جہاں اہل اللہ سے تعلقات استوار ہو کر، ذکر وفکر اور اصلاح نفس کی صورت پیدا ہوتی ہے، وہاں دعوت دین، اشاعت دین اور غلبہ دین کے لئے کام کرنے کی فکر بھی پیدا ہوتی ہے۔

مولانا علی میاں سے میری ملاقات کی صورت تو پیدا نہ ہوسکی، البتہ ان کی تقریر سننے، انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی زیارت کا شرف ضرور حاصل ہوا ہے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں مولانا پاکستان کے دورہ پر تشریف لائے تھے۔ کراچی میں ''فاران کلب'' کے تحت ایک بڑے ہوٹل میں مولانا کا پروگرام ہوا تھا، مولانا کی بہت اہم تقریر تھی، جو بعد میں کتاب میں بھی شامل ہوئی۔ مولانا کے لباس کی سادگی اور ان کی دلبربا اداؤں نے بہت متاثر کیا۔

غالبا ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ ہماری کتاب ''روسی سامراج عالم اسلام کا چیلنج'' شایع ہوئی، سعودی عرب میں جماعت اسلامی کی ایک ذمہ دار شخصیت نے کہلوایا کہ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کا عربی ترجمہ ہونا ضروری ہے۔ آپ اگر عربی میں

ترجمہ کروا کر ہمیں بھجوا دیں تو یہاں ہم اسے شائع کریں گے۔ اس سلسلہ میں میں نے مولانا علی میاں کی خدمت میں کتاب ارسال کی اور خط بھی لکھا کہ اگر آپ کے ہاں اس کے ترجمہ کی صورت پیدا ہو سکے تو ممنوں ہوں گا۔ مولانا نے کارڈ پر جواب دیا کہ آپ کی قیمتی کتاب ملی، لیکن ہمارے ہاں اس کے ترجمہ کی صورت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ آپ پاکستان میں ہی اس کی کوشش کریں۔

اس کے آٹھ دس سال کے بعد راقم الحروف نے مولانا کی خدمت میں کچھ خطوط ارسال کئے اور اپنی متعدد کتابیں ارسال کی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ انگریزی زبان میں پتہ نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی چیز مولانا کو نہ مل سکی۔ البتہ ۱۹۹۲ء میں ہمارے پڑوسی کی والدہ بھارت سے آئی تھیں، وہ واپس جارہی تھی، ان کے ذریعہ ہم نے ''ہمارے کچھ فکری واخلاقی مسائل'' کے نام سے اپنی کتاب اور عریضہ بھی ارسال کیا۔ الحمدللہ یہ کتاب اور خط مولانا کو مل گئے۔ اس کے جواب میں مولانا نے جو خط تحریر کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

تاریخ ۱۸ شعبان

گرامی منزلت جناب محمد موسیٰ بھٹو زادہ اللہ توفیقا

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ مورخہ ۱۰ فروری اور آپ کی فکر انگیز اور دعوتی تصنیف ''اسلام اور ہمارے کچھ فکری واخلاقی مسائل'' ملی، میری ڈاک زیادہ تر دارالاسلام ندوۃ العلماء لکھنو کے پتہ پر آتی ہے اور محفوظ رہتی ہے، میں بعض اوقات دوروں پر رہتا ہوں یا اپنے وطن رائے بریلی میں، اس لئے اس کے مطلع ہونے میں بعض اوقات تاخیر ہوجاتی ہے، یہی صورتحال آپ کے اس گرامی نامہ اور قابل قدر کتاب کے بارے میں پیش آئی۔

میری طرف سے آپ اس قیمتی فکری ودعوتی پیش کش پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

معاف کیا جائے، پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں میں بہت کم اتنی فکری مماثلت اور خیالی توارد محسوس ہوا، جتنا آپ کی اس تصنیف میں، غالبًا یہ (توفیق الٰہی کے بعد) آپ کے ذہنی توازن، عمیق مطالعہ اور تحریکوں، تنظیموں کے حقیقت پسندانہ مطالعہ کا نتیجہ

ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے، اور اہل پاکستان کو اس سے نفع اٹھانے کی توفیق دے۔

آپ نے اپنے خطوط کے جواب کے نہ ملنے کا دوستانہ ومحبانہ شکوہ کیا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مجھے یادنہیں کہ اس سے پہلے مجھے آپ کی کوئی کتاب یا خط ملا ہو، میں خطوط کے جواب کا بحمداللہ بڑا اہتمام کرتا ہوں، لیکن اکثر بیرون ملک کے طویل سفروں پر بھی رہتا ہوں، اس لئے ممکن ہے کہ مجھے آپ کا کوئی خط یا کتاب نہ ملی ہو، بہرحال اس کی معافی چاہتا ہوں۔

میں آپ کی خدمت میں اپنے چند رسائل بھجوا رہا ہوں، امید ہے کہ آپ کی نظر سے گذریں گے۔

امید ہے کہ مزاج ہر طرح بعافیت ہوگا۔

والسلام مع الاکرام
مخلص
ابوالحسن علی ندوی

مولانا نے اس خط میں ایک ایسے شخص کی کتاب کی تحسین فرمائی ہے، بلکہ اسے اپنی فکری مماثلت اور خیالی توارد کے مترادف قرار دیا ہے، جس سے مولانا ذاتی طور پر ناآشنا تھے، جس کی جماعتی اور گروہی وابستگیوں کے بارے میں بھی مولانا لاعلم تھے، اپنے حلقہ سے باہر کے فرد کے دعوتی وعلمی کام کی اس طرح کی حوصلہ افزائی کا عمل پاکستان کے علمائے کرام میں مفقود ہے، بلکہ اس کا تصور بھی مشکل ہے۔

ہمارے ادارہ کی طرف سے جدیدیت کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں پچھلے پچیس تیس سالوں سے شائع ہونے والی اردو وسندھی کتابیں ہماری طرف سے سندھ اور ملک بھر کے اہم مدارس کے ذمہ داروں اور ممتاز علمائے کرام کی خدمت میں ارسال کی جاتی رہی ہیں، لیکن شاید ہی کسی قابل ذکر عالم دین کی طرف سے ان کتابوں کے بارے میں دوحروف پر مشتمل خط موصول ہوا ہو۔

اس پس منظر میں حضرت مولانا علی میاں کی وسعت ظرفی، کشادہ دلی، اپنے حلقہ سے باہر کے علمی ودعوتی کام کی حوصلہ افزائی ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ امت کے مختلف گروہوں سے وابستہ باصلاحیت افراد کے ایک دوسرے سے قریب ہونے کی بھی یہی بہتر صورت ہے۔

مولانا علی میاں نے اپنے خط میں یہ جو فرمایا ہے کہ آپ کی کتاب سے میری فکر مماثلت اور خیالی توارد ہے، اسے یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم مولانا علی میاں کی فکر سے بھرپور استفادہ کرکے، پاکستان میں انہی کی اسلامی فکر کو ترویج دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جدید چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں اس دور میں مولانا علی میاں کی فکر ہی سب سے زیادہ نافع، مؤثر اور متوازن فکر ہے۔ اور دینی حلقوں میں اس فکر سے استفادہ کے سلسلہ میں بظاہر کسی طرح کا کوئی حجاب بھی موجود نہیں، دوسرے مفکروں کی کتابوں سے استفادہ کے سلسلہ میں تو متعدد حجابات ہو سکتے ہیں، لیکن مولانا کی شخصیت تو دیوبند مکتب فکر کی ممتاز فاضل شخصیتوں کی منظور نظر شخصیت ہے۔ ان سے اہل مذہب کو کیا حجاب ہو سکتا ہے۔ **(ماخوذ: بیداری اگست ۲۰۱۵ء)**

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل شخصیت ہیں۔ درس وتدریس کا کام، تصنیف وتالیف کا کام، بیرون ممالک کے دعوتی دورے، سالکان راہ طریقت کی تربیت کا کام، اسلامی بینکاری کے کام کی سرپرستی جیسے متعدد اہم کام ہیں، جو موصوف کر رہے ہیں۔

دارالعلوم کراچی کے طلبہ کی تعلیم وتربیت اور ان کی بہتر ذہن سازی کے سلسلہ میں موصوف جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے، بلکہ دوسرے مدارس کے لئے قابل تقلید ہے۔ چونکہ موصوف وسیع مطالعہ کی صاحب شخصیت ہیں۔ دور جدید کے علمی ونظریاتی چیلنج سے بھی نہ صرف پوری طرح آشنا ہیں، بلکہ اس میں ماہرانہ صلاحیت کے حامل ہیں، اس لئے موصوف طلبہ میں کسی حد تک اپنی یہ فکر بھی منتقل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ موصوف روحانیت کی صاحب شخصیت بھی ہیں۔ اگرچہ روحانی اعتبار سے ان کے زیرتربیت سالکین کی تعداد زیادہ نہیں ہے، تاہم موصوف طلبہ میں اس شعور کو اجاگر کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ راہ سلوک میں چلے بغیر نفسی قوتوں سے آشنائی اور تہذیب نفس کا کام دشوار تر ہے۔ تعلیم سے دین کا بنیادی علم تو آجاتا ہے، لیکن تزکیہ نفس اور باطنی رزائل کی اصلاح کے لئے کسی اہل اللہ سے رجوع ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر علم، اہل علم کے لئے خطرے کا موجب بن سکتا ہے۔

ہر سال رخصت ہونے والے طلبہ، جو دارالعلوم کے فاضل بن کر نکلتے ہیں، انہیں مولانا کی تلقین یہی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ نہیں تو کم از کم مولانا تھانویؒ کی کتابوں سے استفادہ کرتے رہیں۔ ان کی کتابوں کے روزانہ چند صفحات کے مطالعہ کو ضرور معمول بنائیں، اس سے باطنی بیماریوں کا ادراک بھی ہوگا تو ان کی اصلاح کی فکر بھی طاری ہوگی اور معاملات کی اصلاح کی اہمیت بھی واضح ہوتی رہے گی، مولانا، طلبہ سے

یہ بھی فرماتے ہیں کہ میرا معمول ہے کہ میں رات کو سونے سے پہلے حکیم الامت کی کسی نہ کسی کتاب کے چند صفحات ضرور دیکھ لیتا ہوں، اس سے مجھے فائدہ ہوتا ہے۔

حکیم الامت کی کتابوں کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا جو تجزیہ ہے، یہ عاجز ان کے اس تجزیہ سے سوفی صد متفق ہے کہ ان کی کتابوں میں کچھ اس طرح کی کشش موجود ہے کہ وہ فرد کو اپنی طرح کھینچنے لگتی ہیں اور باطنی امراض کے سلسلہ میں مولانا کے بیان کردہ نکات پر فرد چوکنا ہوجاتا ہے کہ یہ تو مولانا نے میری کمزور رگ پکڑی ہے اور مجھے بیدار کرنے کی کاوش کی ہے اور خرابیٔ معاملات کے سلسلہ میں بیان کردہ نکات گویا مجھے متنبہ کرنے اور میرے معاملات کو درست کرنے کے لئے بیان فرمائے ہیں۔

مفتی صاحب کی شخصیت میں زہد، سادگی، فنائیت، دنیا سے استغنا دوسروں کو اذیت نہ پہنچانے اور نفیٔ ذات اور فنائیت کی جو ادائیں موجود ہیں، وہ ان کی شخصیت کی عظمت کے لئے کافی ہیں۔

اسلامی بینک، میزان بینک اور عالم اسلام کی مختلف اسلامی طرز کی بینکوں کی سرپرستی کرنے اور ان کے شرعی ایڈوائیزر ہونے کے باوجود ان سے کوئی معاوضہ نہ لینا اور ذاتی طور پر ان کی امداد قبول نہ کرنا اور اس سارے کام کو ایک دینی ذمہ داری کی حیثیت سے سرانجام دینا، مفتی صاحب کی یہ بے لوثی ہمارے لئے، بالخصوص علم وروحانیت کے مقام پر فائز دور جدید کی شخصیتوں کے لئے مثالی نمونہ بھی ہے تو اتمام حجت بھی۔

مولانا عاشق الٰہی بلند شہری (جو دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث رہ چکے ہیں اور جو صاحب دل شخصیت تھے) انہوں نے دینی مدارس کے موضوع پر اپنے ایک مضمون میں جو القاسم ''رسالہ میں چھپا ہے، لکھا ہے کہ مدارس کو دنیاوی علوم کا سنگم بنایا جائے گا تو وہاں سے فارغ ہونے والے دنیا دار بن کر ہی نکلیں گے اور دنیا ہی کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ سوائے مولانا مفتی محمد عثمانی کے، انہوں نے جدید علوم پڑھے، لیکن ان علوم سے مرعوب ومتاثر نہ ہوئے، اس کا سبب شیخ کامل ڈاکٹر عبدالحیؒ اور حضرت مفتی محمد شفیعؒ کی طویل عرصہ کی صحبت ہے۔

مولانا عاشق الٰہیؒ کی یہ بات بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا درس وتدریس کا کام ہی ایسا کام ہے کہ اگر وہ دوسرے کام نہ بھی کرتے تو ان کا یہی کام ایسا ہے، جو ان کی شخصیت کے علمی فیض کو قائم رکھنے کے لئے کافی تھا، ہزاروں طلبہ ہیں، جو ان کے فیض یافتہ ہیں اور جو ان کے علم، ان کی سادگی، ان کی تقویٰ وللھیت، ان کے تبحر علمی اور رسوخ فی الدین کے رطب السان ہیں۔ درس وتدریس کے ساتھ کتابوں کی تصنیف کا کام بھی مولانا کے اہم کاموں میں شامل ہے۔ ان کی کئی درجن کتابیں ہیں، جو ان کے صاحب علم وصاحب فضل اور جدیدیت سے آشنائی کی واضح علامت ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کے دینی ودعوتی کام بالخصوص ان کے علمی وتحقیقی کام اور ان کی کتابوں پر تفصیل سے گفتگو کرکے، ان کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ ان کی زمانہ کے فتنوں پر بھی گہری ہے، وہ ان علمائے ربانیں میں شامل ہیں، جو اپنی علمی وروحانی صلاحیتوں اور حمیت دین اور تحرک سے زمانہ کے رخ کو بدلتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی صاحب کی تنقیدی تحریر میں عام طور پر نرمی ومحبت کا پہلو غالب ہے۔ اس سلسلہ میں تقلید کے موضوع پر مشہور اہل حدیث عالم کے جواب میں موصوف کی لکھی گئی کتاب یا مولانا مودودی کی خلافت وملوکیت کے جواب میں لکھی گئی کتاب میں اختیار کردہ نرمی کا اسلوب دوسرے علماء کے لئے قابل تقلید ہے۔ تاہم اس معاملہ میں ان کی بعض تنقیدوں میں کچھ سختی شامل ہوگئی ہے۔ مثلا مولانا عبدالحمید سواتی، جو مولانا سندھی کے فکر کے حامل ہیں، ان پر تنقید میں مولانا سواتی کی شخصیت مجروح ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ تنقید مفتی رضوان احمد صاحب کی مرتب کردہ مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار کے جائزہ پر مشتمل کتاب میں بھی شامل ہے۔

طبقہ علماء کے لئے موصوف کی یہ رواداری بھی قابل تقلید ہے کہ انہوں نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں مولانا مودودی کے ذکر کے ساتھ انہیں رحمتہ اللہ لکھا ہے، ہمارے علمائے کرام اس سلسلہ میں عام طور پر مولانا مودودی کی فکر اور کام کے بارے میں غیر

متوازن رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں، چونکہ حضرت مفتی صاحب نے ان کی فکر کو اچھی طرح پڑھا ہے، ان کی فکر پر لکھی گئی تنقیدی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے، اس لئے موصوف مولانا مودودی سے متعدد معاملات میں اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ان سے حسن ظن رکھتے ہیں اور مادی نظریات سے متاثر نوجوان نسل کے لئے ان کی فکر کو مفید سمجھتے ہیں۔

ہمارے علمائے کرام اگر جدیدیت کے وسیع پس منظر میں اسلامی مفکروں کا مطالعہ کریں تو مولانا مودودی کے سارے فکری نقائص کے باوجود انہیں نظر آئے گا کہ مغربی نظریات پر ان کی تنقید اور مغربی فکر سے متاثر نوجوان نسل کی اسلام پر اعتماد کی بحالی کے سلسلہ میں ان کا کردار، نہایت اہم اور فیصلہ کن کردار ہے پھر مولانا مودودی نے غلبہ اسلام کے کام کے لئے فضا پیدا کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ سب سے اہم کردار ہے، حضرت مفتی صاحب، مولانا مودودی کی شخصیت اور فکر کو دراصل اسی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

مفتی صاحب کی شخصیت علمی، فکری اجتہادی وروحانی صلاحیتوں کے اعتبار سے پاکستان کی ملت اسلامیہ کے لئے سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی شخصیت میں وہ بیشتر صلاحیتیں وصفات موجود ہیں، جو مفکر اسلام مولانا علی میاں کی شخصیت میں موجود ہیں، لیکن ہماری نظر میں حضرت مفتی صاحب سے اپنی ان صلاحیتوں کے صحیح استعمال کے سلسلہ میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کے طبقہ علماء میں مولانا علی میاں کی طرز کی ایک بھی شخصیت ابھر نہ سکی، جس کی آواز علمی طبقے ساتھ ساتھ ہر مکتبہ فکر کے مذہبی حلقوں میں سنجیدگی اور محبت سے سنی جاتی ہو۔ اور جن کی قدر وقیمت سب کے دل میں یکساں ہو۔ نیز مولانا علی میاں نے جدیدیت کے چیلنج کے فہم، اور اس چیلنج کے مقابلہ اور دور جدید کے انسان کے سامنے اسلامی دعوت کے صحیح منہج کی پیشکش کے سلسلہ میں لکھنے والوں کی جو بڑی ٹیم پیدا کی ہے، جو ہندستان میں علمی وفکری محاذ پر کام کررہی ہے، پاکستان میں طبقہ علماء میں ان صلاحیتوں کے لکھنے والے افراد نہ ہونے کے برابر ہیں۔

حضرت مفتی صاحب اگر اب بھی صحیح حکمت عملی تشکیل دے کر، پاکستان کی ملت

اسلامیہ کی سطح پر اس خلا کو کسی حد تک پُر کرنے کی کوشش فرمائیں تو یہ ملت پر ان کا زبردست احسان ہوگا۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک تو موصوف درس وتدریس کے کام میں تخفیف فرمائیں، درس وتدریس کے کام کے لئے ان کی تیار کردہ متعدد شخصیتیں پیدا ہوگئی ہیں۔

دوسرے یہ کہ موصوف دارالعلوم کے دائراتی ماحول اور دیوبند مکتبہ فکر سے بلند ہو کر، اپنی شخصیت کو ملت اسلامیہ کے عظیم سرمایہ کی حیثیت سے سامنے لائیں، تاکہ ہر مکتبہ فکر کے علمی افراد بغیر کسی حجاب کے ان کی شخصیت سے استفادہ کرسکیں، اگر حضرت نثار احمد خان فتحی صاحب جدیدیت کے چیلنج کے حوالے سے ایک بہتر علمی کتاب لکھتے ہیں اور ایک آدھ صفحہ کے تعارف کے طور پر ان کی خدمت میں ارسال کرتے ہیں تو اس طرح کی کتاب کے تعارف لکھنے میں وقت کی کمی یا دائراتی ماحول کے حجابات حائل نہ ہونے پائیں، مولانا علی میاں اس طرح کے کاموں کو دوسرے اہم کاموں کی طرح اہمیت دیا کرتے تھے۔ ہم جیسے عامی فرد کی کتاب پر انہوں نے تفصیلی خط کی صورت میں جامع تبصرہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے حلقہ سے باہر کے اہل علم کے لئے وسعت ظرفی کا مظاہرہ فرماتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب جیسی شخصیت کے لئے وقت کا سب سے بڑا چیلنج جو موجود ہے، جو ان کی توجہ اور وقت چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ مغرب سے دہریت اور مادہ پرستی کا سیلاب نئے سرے سے پوری قوت سے ابھر کر، انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لینے کے ساتھ ساتھ عالم اسلام اور پاکستانی ملت کو بُری طرح لپیٹ میں لے رہا ہے۔ یہ طوفان وسیلاب دینی مدارس کی دیواروں کو عبور کرکے، ان کے اندر بھی داخل ہو چکا ہے، اس کے مقابلہ کے لئے اس عاجز کی نظر میں کچھ تدابیر کی ضرورت ہے۔ جنہیں ترجیح کے طور پر پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ایک یہ کہ دارالعلوم جیسی عظیم جامعہ میں دوچار ایسے ماہر اساتذہ کا تقرر ہو، جو یورپ میں دھائی تین سو سال سے اٹھنے والے نظریات اور فکری لہروں سے پوری طرح آشنا ہوں اور ساتھ ساتھ جدید اسلامی فکر میں پچھلے ایک سو سال سے ان فکری لہروں کے جو اثرات شامل ہوگئے ہیں، اس پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہوں، تاکہ آخری سطح کے

طلبہ کی ذہن سازی میں جدیدیت کے اس فہم کی بہتر سے بہتر صورت پیدا ہو سکے۔

دوم یہ کہ دارالعلوم جیسے مدارس کے آخری سال کے طلبہ کے لئے عملی تصوف کے اجزاء کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ اس لئے کہ موجودہ دور میں اہل اللہ کی صحبت اور راہ عشق کے بغیر محض علم کی بنیاد پر علماء کا مادیت پرستی کی ہمہ گیر لہروں سے بچنا دشوار تر ہے۔

اگرچہ یہ عاجز کسی بھی اعتبار سے اس قابل نہیں ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی جیسی ممتاز علمی، فکری، مجتہدانہ اور روحانی صلاحیتوں کی حامل شخصیت کے سامنے کچھ معروضات پیش کرسکے۔ یہ شاید ایک اعتبار گستاخی میں شامل ہو، لیکن حضرت مولانا علی میاں کی فکر میں عرصہ تک ڈوب جانے کے نتیجہ میں ہی یہ معروضات پیش کرنے کا حوصلہ ہوا ہے۔

(۲)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا ایک اہم کام اسلامی بینک کاری کے خطوط کا تعین ہے۔ یہ کام ایسا ہے، جو طبقہ علماء میں انہی کے ساتھ مخصوص ہے، بلکہ انہیں اسلامی بینک کاری کا بانی کہنا زیادہ صحیح ہے، اگرچہ اس پر مختلف علمائے کرام کی طرف سے تنقید بھی ہوئی۔ کتابیں بھی شائع ہوئیں، لیکن اجتہادی صلاحیتوں کے حامل علما کا اختلاف باعث خیر ہے، نہ کہ باعث زحمت، دونوں طرف خیر کے اجزاء موجود ہیں اور جذباتِ اخلاص کارفرما ہے۔ اختلاف رائے رکھنے والے علماء کرام کا کہنا ہے کہ کہیں اسلامی بینک کاری کا نقشہ سرمایہ داری نظام کا چربہ نہ بن جائے اور اس کی بدلی ہوئی صورت یا اس سے مشابہت نہ ہوجائے اور سودی نظام اور اسلامی نظام کے اس نقشہ میں مماثلت پیدا نہ ہوجائے، جب کہ مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ وہ اس موضوع پر مجتہد عالم کی حیثیت سے سات سال تک غور وفکر کرتے رہے ہیں۔ سات سال کے غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سرمایہ داری کے سودی نظام کے مقابلہ میں اسلامی معیشت کا آغاز کار ہونا چاہئے۔ اور معاشرہ کو اس دلدل سے نکالنے کے لئے معیشت کی مثبت اسلامی بنیادوں کو عملی صورت دیدینی چاہئے۔

مفتی صاحب نے اسلامی معیشت کے سلسلہ میں پیش قدمی کا مظاہرہ کرکے،ہمت وجرئت سے کام لیا ہے۔ہر بڑے کام میں خطرات تو موجود ہی ہوتے ہیں اور مخالفت بھی ہوتی ہے۔لیکن اخلاص کے نتیجہ میں راہیں نکل آتی ہیں۔

فقہاء کی اصطلاح میں اس کام کو حیلہ کہا جاتا ہے، حیلہ کی رو سے مضاربت ومشارکت کی بنیاد پر کاروبار کی مختلف صورتیں اختیار کی جائیں گی۔ چونکہ عملی قانون میں خلا نہیں ہوتا، اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ دینا ضروری ہوتا ہے اور یہ علماء ہی کا کام ہے۔ بالخصوص جب ملت کی اجتماعی ضرورت ہو تو حیلہ سے کام لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ البتہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ حیلہ اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔ لیکن بجائے خود حیلہ پر اعتراض درست نہیں۔ البتہ حیلہ کی فنی وٹیکنیکل صورت پر اعتراض ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا نکتہ جو اہم ہے، وہ یہ ہے کہ تنقید کو عمل کی بہتری میں معاون ہونا چاہئے، نہ کہ رکاوٹ۔

اس سلسلہ میں تیسرا نکتہ جو ہم پیش کریں گے،وہ فاسد معاشرہ کے حوالے سے اسلامی حکمت عملی کا نکتہ ہے۔

ہماری نظر میں فاسد زدہ معاشرہ میں جب نفاذ اسلام کا کام ہوگا یا مثالی اسلامی معیشت کے طرف پیش قدمی ہوگی تو اس میں افرادِ معاشرہ کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی وایمانی حالت کو پیش نظر رکھکر ، تدریج اور ترتیب کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اس لئے کہ فاسد معاشرہ بیک وقت مثالی اسلامی نظام یا مثالی اسلامی معیشت کو اختیار کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہوگا اور وہ اس کی شدید مزاحمت کرے گا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ فرمانا کہ اگر ایمان کی مضبوطی اور اس کے لئے فضا پیدا کرنے سے پہلے شرعی قوانین نازل ہوتے تو نئے مسلمان ہونے والا معاشرہ اسے قبول نہ کرتا، اس لئے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ایمانی اور پاکیزہ اخلاقی حالت کو پیش نظر رکھکر ، اسلامی قوانین کے نزول میں تدریج اور ترتیب کو ملحوظ رکھا اور سود کو تین مختلف مرحلوں میں حرام قرار دیا، اسی طرح شراب کے حرام ہونے کا قانون بھی بتدریج تین مرحلوں میں جاکر نازل ہوا۔

اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بتاتی ہے کہ اسلام

ایک عملی نظام ہے، جو اپنے وقت، حالات وزمانہ اور لوگوں کی دینی، ایمانی اور اخلاقی حالت کو دیکھتے ہوئے پیش قدمی یا ارتقا کا علمبردار ہے۔ اسلام، فاسد معاشرہ سے یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں مثالی اسلامی نظام یا مثالی اسلامی معیشت کو اختیار کرنے پر آمادہ ہوگا، اس کے لئے حکیمانہ ترتیب ناگزیر ہے۔

یقیناً مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اسلام کے اسی مزاج کو پیش نظر رکھکر ، ظالمانہ سرمایہ داری نظام کے غلبہ کے دور میں اسلامی نقطہ نگاہ سے معیشت کی خاردار وادی میں قدم رکھا ہے۔

اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی بینک کاری کا موجودہ نقشہ ایک تو سرمایہ داری نظام کے ہاتھوں پسے ہوئے افراد کو سہارا دینے، انہیں مشکلات سے نکالنے کی ایک تدبیر ہے، دوم یہ کہ یہ مثالی اسلامی معیشت کی طرف پیش قدمی کے سلسلہ میں زینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ بینک کاری نظام میں کام کرنے والے افراد میں اخلاص اور اسلامی تحرک موجود ہو، اور ان کی ایمانی حالت میں بہتری کی فضا پیدا ہوتی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ مثالی اسلامی معیشت کے خطوط کیا ہیں، اور اس کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اس کی تفصیل مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اپنے ایک تفصیلی مقالہ میں پیش کی ہے، ان کا یہ مقالہ ۱۹۷۰ء میں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا تھا، جو اس وقت کے مختلف رسائل میں شائع ہوا تھا۔''بیداری'' نے الفرقان لکھنو کے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون شائع کیا تھا۔

اس میں حضرت مفتیؒ نے مثالی اسلامی معیشت کی جو بنیادیں پیش کی ہیں، وہ بہت اہم ہیں، یہ پورا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ طویل مضمون ہے۔ جس میں اسلامی معیشت کا سرمایہ دارانہ طرز معیشت اور کمیونزم کے معاشی نظام سے تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ہم حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے اسلامی معیشت کے پیش کردہ ابتدائی خطوط کے حوالے سے مفتیؒ کے مقالہ کے دوچار اقتباسات دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد:

''اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے اور جس کا خاکہ انشاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

الف: ایک قابل عمل نظام معیشت کا قیام ..... تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے، جو فطری اور قابل عمل ہو اور جس میں ہر انسان جبر وتشدد کی بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت، اپنی استعداد، اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے، تاکہ اس کی خدمات زیادہ موثر، مفید اور صحت مند ہوں، اور یہ بات مستاجر (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور ''آجر'' کے صحت مند رشتے اور ''رسد'' و ''طلب' کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

ا: اس بات کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں جامع ارشاد فرمایا گیا ہے:

نحن قسمنا بينهم معيشتهم فى الحيواة الدنيا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات ليتخذ بعضهم بعضا سخريا.

ترجمہ: ہم نے ان کے درمیاں ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے، تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

ب: حق کا حقدار کو پہونچانا ..... اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہونچانا ہے، لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں، انہیں کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس۔ اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلا اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر

فرماتا ہے، اس لیے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عالمین پیدائش ہی نہیں ہوتے، بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے، جس تک دولت کا پہنچنا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا فقراء ومساکین اور معاشرے کے نادار اور بے کس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں، اس لیے کہ جن عوامل پیدائش پر اولا دولت تقسیم ہوتی ہے، ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہے۔

فى اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم . ترجمہ: اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک متعین حق ہے۔

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے، کھیتوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے:

وآتو حقه يوم حصاده. اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔

ان دونوں آیتوں میں ''حق'' کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ عمل پیدائش ہی نہیں ہے، بلکہ مفلس ونادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اس طرح مستحق ہیں، جس طرح اس کے اولین مالک، لہٰذا اسلام، دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے اور اس کے بعد لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے، جنہیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے (ان دونوں کے حقداروں کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی)۔

ج۔ ارتکاز دولت کی بیخ کنی ..... تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے اہمیت دی ہے، یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کردے۔ اور اس طرح امیر وغریب کا تفاوت، جس حد تک فطری اور قابل عمل ہو، کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرز عمل یہ ہے

کہ دولت کے جو اولین ماخذ اور دہانے ہیں، ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرا نہیں بیٹھنے دیا، بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے، کانیں، جنگل اور غیرمملوکہ بنجر زمینیں، جنگل اور پانی کا شکار، خود رد گھاس، دریا اور سمندر، مال غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائش دولت کے اولیں ماخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب وعمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم. ترجمہ: تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی شخص اپنے کسب وعمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب وعمل کا احترام کرکے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب وعمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیواة الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا.

ترجمہ: ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیے گئے ہیں کہ یہ فرق اس قدر رہے، جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹا رہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسرا دونوں سے، جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔''

سرمایہ داری اور اسلام

''اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیمِ دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کیے ہیں، ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیاں مندرجۂ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں۔

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کردیا گیا ہے۔ اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں، بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) سرمایہ کا صلہ ''سود'' کے بجائے ''منافع'' قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں ''سرمایہ'' کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں ''پیداشدہ ذریعہ پیدائش'' سے کی جاتی ہے۔ لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے۔ لیکن ہم نے اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے ''سرمایہ'' کی جو تعریف کی ہے، اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں، جنہیں خرچ کیے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا مثلاً روپیہ، مشینری اس تعریف کی رو سے ''سرمایہ'' میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح ''زمین'' کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے، جن سے استفادہ کے لیے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہوگئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے اور اس میں ذہنی محنت اور منصوبہ بندی بھی شامل ہوگئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ''آجر'' کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے ''منافع'' کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ بتائی جاتی ہے

کہ وہ کاروبار کے نفع ونقصان کا حصہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر ہے ''منافع'' اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا، جس میں اگر نقصان ہوجائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے، باقی تینوں عوامل پیداوار میں سے سرمایہ کو معین سود۔ زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اجرت مل جاتی ہے۔ اس لیے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ درحقیقت ''نقصان کا خطرہ مول لینے'' کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہیے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے، اس کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لیے جو سرمایہ دار ہے، وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے اور جو شخص آجر ہے، وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ انفرادی کاروبار۔ سرمایہ لگانے ولا بلا شرکتِ غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے گا۔ اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا، وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف ''منافع'' کہلائے، لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانے کی وجہ سے ''منافع'' کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے ''اجرت'' کا۔

شرکت۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع ونقصان میں بھی، اسے فقہی اصطلاح میں ''شرکتہ العقود'' کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں بھی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے ''منافع'' کے حق دار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے ''اجرت'' کے، یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا۔ اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہوگیا۔

(۳) مضاربت۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اسے فقہی اصطلاح میں ''مضاربت'' کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ ''نفع'' کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو اجرت کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار چلانے والے مضارب کو کاروبار میں نقصان ہوجائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا، اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا۔ اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہائے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ ان تین صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔''

(۳)

مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے جس سیلاب کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، یہ سیلاب دراصل مادی فکر اور مادی نظریات کے غلبہ ہی کا نتیجہ ہے، یورپ میں اس وقت بھی آدھی سے زیادہ آبادی دہریت اور خدا، وحی اور دین ومذہب کے انکار پر یقین رکھتی ہے۔ مسلم ملت کے جدید تعلیم یافتہ ذہین طبقات بھی اسی مادی فکر سے مرعوبیت کے نتیجہ میں ہی مغرب کو اپنا رہبر اور قبلہ وکعبہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہماری سندھی آبادی کے ہزاروں سے زیادہ ذہین افراد جدید مادی نظریات پر اسی طرح یقین رکھتے ہیں، جس طرح یورپ کے مادہ پرست افراد رکھتے ہیں۔

ان افکار ونظریات کے علمی تعاقب اور اس حوالے سے اپنی نسلوں میں اسلام پر اعتماد کی فضا پیدا کرنا، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ بلکہ وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ حسن عسکری صاحب جو ترقی پسند اور سیکولر فکر کے بڑے نقادوں میں شامل تھے اور جو پاکستان میں اپنے دور میں ادب اسلامی کے حلقے کی سرخیل تھے، جن کے مفتی صاحب سے مراسم بھی تھے، ان کی خواہش وکوشش تھی کہ مفتی صاحب جدید دور

کے اس سب سے بڑے چیلنج کے مقابلہ کے محاذ کو سنبھالیں اور خدا، دین ومذہب اور وحی پر اعتماد ختم کرنے کے لئے مغرب کے مادہ پرست ذہن نے پوری منصوبہ بندی سے شکوک وشبہات واعتراضات کا نہ ختم ہونے والا جو سلسلہ شروع کیا ہے،اس کا پوری طرح ادراک حاصل کریں اور وسیع مطالعہ کے بعد اپنے شاگردوں کے ذریعہ اس فکر کے سامنے بند باندھنے کی کاوش فرمائیں۔حسن عسکری صاحب نے چالیس پچاس سال پہلے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور اس کی کوشش بھی کی تھی، اس سلسلہ میں موصوف لکھتے ہیں:

''دوسو گمراہیوں کی فہرست میں نے مرتب کی تھی، جو ہمارے ہاں بھی رائج ہو چکی ہیں، اور جنہیں دور کئے بغیر انگریزی تعلیم پانے والوں کو دین کی باتیں نہیں سمجھائی جا سکتی، یہ فہرست میں نے حضرت مفتی محمد شفیع کی خدمت میں پیش کی تھی۔ خیال یہ تھا کہ مولوی محمد تقی صاحب فہرست کو سامنے رکھکر اپنے طالب علموں کو ایک خاص قسم کا کورس پڑھائیں۔ (مجموعہ محمد حسن عسکری صفحہ۱۱۷۴)

واضح ہوکہ حسن عسکری صاحب کا دوسو سوالات واشکالات والا مضمون ''بیداری'' ۲۰۱۳ء کے شماروں میں تین قسطوں میں چھپ چکا ہے۔

(۴)

یہ عاجز سوچ رہا ہے کہ مفتی صاحب جیسی عظیم شخصیت کے فکر ونظر پر خامہ فرسائی کرنے اور ان کی خدمت میں وقت کے چیلنج کے حوالے سے تجاویز پیش کرنے میں کہیں دعویٰ کا جذبہ تو کارفرما نہیں۔ یا اس میں گستاخی کا پہلو تو شامل نہیں؟ اگر یہ دونوں باتیں شامل نہ بھی ہوں تو بہرحال چھوٹا منہ بڑی بات تو ضرور ہوگی۔ زیادہ مطالعہ، زیادہ لکھنا اور شخصیتوں کے فکر ونظر پر تنقید ایک اعتبار سے یقیناً افادیت کے حامل ہے۔لیکن اس اعتبار سے فرد کے لئے سخت مضر بھی ہے کہ وہ ملت کی اہم شخصیتوں کے فیوض سے محروم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہوسکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خرابیوں سے بچائے اور ہم جیسے بسیارنویسیوں کی اصلاح کی بہتر صورت پیدا فرمائے۔ **(ماخوذ بیداری: مارچ ۲۰۱۶ء)**

مولانا محمد کلیم صدیقی

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب، اس وقت عالم اسلام کے سب سے بڑے داعی ہیں، جو غیرمسلموں کے محاذ پر اسلامی دعوت کا کام کررہے ہیں۔ ان کی شخصیت سراپا دعوت ہے۔ ان کی گفتگو تاثیر سے بھرپور اور دلوں کو بدلنے والی ہے، ان کی ادائیں زندگی کی کایا پلٹنے والی ہیں۔قول وعمل میں یکسانیت کے اعتبار سے وہ بے مثال شخصیت ہیں۔ غیرمسلموں میں دعوت اور نومسلموں کی تعلیم وتربیت کے کام کو انہوں نے زندگی کا ہدف بلکہ اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ وہ سادگی کا مجسمہ ہیں۔ ہزاروں مرید ہیں،جو ان پر فدا ہونے کے لئے تیار ہیں۔لیکن وہ مریدوں سے کوئی بھی مفاد وابستہ کرنے اور ان کے ذریعہ مادی خوشحالی کے روادارنہیں۔ سادہ زندگی کی حالت یہ ہے کہ وہ ریل گاڑی میں تیسرے کلاس میں سفرکرتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے اب تک ہزارہا ہندومسلمان ہو چکے ہیں۔مسلمان ہونے والے ان ہندوں میں علمی،خاندانی اور مالی اعتبار سے بڑی حیثیت کے ہندو بھی شامل ہیں۔

نومسلموں کی تربیت وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ دین کے بنیادی تقاضوں سے پوری طرح آشنا ہوکر، خود داعی بن کر زندگی گذارنے کے کام کو فیصلہ کن کام سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کے ذریعہ غیرمسلموں میں کام کرنے والے ہزارہا باصلاحیت افراد داعی کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب، مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے خلیفہ مجاز ہیں، انہوں نے برسوں تک ان کی صحبت اختیار کرکے، ان سے آداب زندگی سیکھے ہیں۔ دینی حمیت، دعوتی حکمت عملی، اپنوں اور غیروں کی دل جوئی کی ادائیں، دنیا سے بے نیاز ہو کر سادہ زندگی گذارنے کا انداز، دوسروں میں اپنی زندگی اور سیرت کا رنگ ڈھنگ منتقل کرنے کی ادائیں، عاجزی، انکساری اور فنائیت کا اسلوب، جماعتی، گروہی اور مسلکی

دائروں سے بلند ہو کر وحدت امت کے تصور کو فروغ دینے کا داعیہ، مسائل ومعاملات میں متوازن طرز عمل اور حکیمانہ انداز فکر، عالمی حالات کے پس منظر میں امت کے لئے صحیح لائحہ عمل اور سالکان راہ طریقت کی صحیح خطوط پر تربیت جیسی ساری چیزیں موصوف نے وقت کے عارف اور مفکر اسلام سے برسوں کی صحبت کے ذریعہ نہ صرف سیکھی ہیں، بلکہ مولانا ندوی کی ان خصوصیات کو اپنے دل وروح کا حصہ بنایا ہے۔

امت پر مولانا ندویؒ کے دوسرے احسانات کے علاوہ ایک بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے امت کو مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب جیسی صاحب علم وفضل، داعیٔ اسلام، متقی، مربی اور صاحب کردار شخصیت عطا کی۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کی بیعت کا قصہ بھی عجیب ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے موصوف کی طبعی مناسبت اگرچہ پہلے سے موجود تھی، لیکن ان کے ساتھ محبت کے رنگ کے غالب ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت ان سے بیعت ہونے میں لطیف حجاب محسوس کرتی تھی، چنانچہ موصوف بیعت کے لئے حضرت مولانا زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی درخواست کی، حضرت مولانا زکریاؒ صاحب کشف شخصیت تھے، انہوں نے کہا کہ آپ بیعت تو مولانا علی میاں سے ہوں، آپ کی تربیت بھی وہی کریں گے، البتہ خلافت آپ کو میں دیدیتا ہوں۔ اسی طرح موصوف ہندستان کی ایک دوسری بڑی روحانی شخصیت کی خدمت میں بھی بیعت کے لئے حاضر ہوئے، انہوں نے بھی یہی کہا کہ آپ بیعت تو مولانا علی میاں سے ہوں۔

ان دونوں بزرگوں نے کشف کے ذریعہ موصوف کی صلاحیتوں کو دیکھ لیا تھا کہ وہ آخرکار مجاہدوں کے ذریعہ اس مقام پر فائز ہوں گے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب ہندستان میں دعوت کے محاذ پر جو کارنامے سرانجام دے رہے ہیں، اس میں جہاں ان کے ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں، خصوصی تعلق باللہ، حمیت دین، سیرت وکردار کی پاکیزگی وبلندی، اخلاص، للّٰہیت وبے نفسی اور حکیمانہ اداؤں کو عمل دخل حاصل ہے، وہاں انسانیت کے لئے ان کے بے پناہ درد، کفر

کی حیثیت سے غیرمسلموں کے لئے دائمی زندگی میں ان کے لئے مستقل عذاب کی کڑھن، اس سلسلہ میں اضطراب کے انگاروں پر لیٹنے کی ادائیں بھی شامل ہیں۔ لیکن اس میں سب سے بڑا عامل اللہ کا خاص فضل شامل ہے کہ اللہ نے اس کام کے لئے انہیں گویا متعین کیا ہے، اور ان کی تربیت کے لئے وقت کے عارف اور مفکر اسلام مولانا علی میاں کو اس کا ذریعہ بنایا۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کی ایک تو خانقاہ ہے، جہاں ذکر وفکر کے لئے ہندستان بھر سے ان کے متوسلین رجوع ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ مولانا کے ہاں مختلف شہروں میں دعوتی کیمپوں کا انتظام ہوتا ہے۔ ان کیمپوں کے ذریعہ غیرمسلموں تک دین کی دعوت پہنچانے کا کام ہوتا ہے۔ سوم یہ کہ مولانا خود بھی اکثر دعوتی دوروں میں رہتے ہیں۔ مولانا کے خون وجگر اور غیرمعمولی فکر مندی کی وجہ سے انہیں ہر جگہ ایسے باصلاحیت افراد مل گئے ہیں، جو ان کے دعوتی کام کے فروغ اور اس کی تقویت کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ مولانا اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں اور امت کے لئے سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، کاش کہ مولانا کے خون جگر اور بے پناہ دعوتی جذبہ کی حامل اور سیرت وکردار کے اعتبار سے مثالی شخصیت ہمارے ہاں بھی پیدا ہوجائے تو ہمارے یہاں بھی دعوتی محاذ متحرک وفعال ہوسکتا ہے اور اس محاذ میں پائے جانے والا خلا دور ہو سکے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کے ہاتھوں پر مسلمان ہونے والے باصلاحیت اور اہل علم افراد کی ایمان افروز کہانی ''نسیم ہدایت کے جھونکے'' کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل کتاب میں چھپ چکی ہے، جس میں نومسلموں نے قبولیت اسلام کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی نئی ایمانی زندگی، ایمانی حلاوت، خوشگوار اور پاکیزہ احساسات اور اسلام جیسی عظیم نعمت کی یافت اور اس اسلامی زندگی کو اپنے خونی رشتہ کے عزیزوں تک پہنچانے کے والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی بساط کے مطابق کام بھی شروع کر دیا ہے۔

یہ کتاب ایسی ہے، جو خواب غفلت میں سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے

کے سلسلہ میں بھی مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے تو الحادی نظریات اور سیکولرزم کو قبول کرنے والے مسلمانوں کو جھنجھوڑنے میں بھی بہت مؤثر ثابت ہوسکتی ہے۔

ویسے تو مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کی زندگی وسیرت وکردار کے سارے پہلو ایسے ہیں، جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ زہد، سادگی، قناعت، دنیا سے استغنا، شہرت ونام ونمود سے بے نیازی، اپنے کام کی پبلیسٹی سے عدم دلچسپی، فنائیت، مسلمانوں کی حالت زار پر فکرمندی، حکمت، بصیرت، صبر، تحمل، بُردباری، پوری امت کے درد میں گھُلنا وغیرہ۔

لیکن ایک خاص ادا، جس کا پاکستان کے مذہبی طبقات میں غیرمعمولی فقدان ہے، وہ اپنے دائرہ اثر کے باہر کے دینی وعلمی ودعوتی کام کو کھلے دل سے تسلیم کرنا اور اس کی تعریف کرنا اور اس کام کو اپنا کام تصور کرنا ہے۔ 'نسیم ہدایت کے جھونکے' کتاب میں مولانا کا تفصیلی انٹرویو شامل ہے، اس میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا کے اس جامع انٹرویو سے جہاں مسلم امت کے مسائل، بحران اور اس بحران سے نکلنے کے سلسلہ میں مولانا کا موقف سامنے آیا ہے، وہاں بیشتر مسائل پر مولانا کا متوازن نقطہ نگاہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اسلام کی صحیح تشریح سے لے کر مسلم ملت کی وحدت جیسے مسائل پر مولانا کا یہ موقف ایسا ہے، جو اگر عام ہوجائے تو مسلم امت متوازن فکر کی حامل ہوسکتی ہے۔ اور اسلام کی تشریح کے نام پر امت میں موجود تقسیم اور اس کے اثرات بد سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

اس وقت مسلم امت کا مسئلہ فکری بھول بھلیوں میں مبتلا ہوجانا، سلف کی دینی فکر، دینی اہداف اور بہتر دعوتی حکمت عملی سے دور ہوجانا ہے۔ مولانا محمد کلیم صدیقی کی زندگی اور ان کا کام ایسا ہے، جو اس سلسلہ میں ہمارے لئے ہر اعتبار سے رہنمائی کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کے دعوتی کام کا ہدف غیرمسلم ہیں، وہ غیرمسلموں کو مسلمان بنا کر، ان کی بہتر تربیت کے لئے کوشاں ہیں اور ان کے ذریعہ غیرمسلموں

تک دعوت کی بات پہنچانی ہے بلکہ موصوف دعوت کے لئے ایک تحریک برپا کررہے ہیں، بلکہ کر چکے ہیں۔ جب کہ تبلیغی جماعت کا ہدف مسلمانوں میں دعوتی بات عام کرنی ہے اور مسلمانون کو گھر اور بازار کے ماحول سے نکال کر مسجد کے ماحول میں لانا ہے اور نورانی اعمال کے ذریعہ انہیں بہتر مسلمان بنانا ہے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کا دائرہ کار تبلیغی جماعت کے دائرہ کار سے جدا گانہ ہے۔ دونوں کاموں کی اہمیت مسلمہ ہے، لیکن چونکہ تبلیغی جماعت میں عام طور پر اپنے کام کے علاوہ دوسرے کاموں کی اہمیت اور قدروقیمت نہ ہونے کے برابر ہے، اس مزاج کی وجہ سے تبلیغی جماعت کے کارکنوں کی طرف سے مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کے کام کی حوصلہ افزائی کی صورت ناپید ہے بلکہ کچھ مخالفت بھی ہے۔ اس مخالفت کے باوجود مولانا موصوف نے اپنی غیرمعمولی روحانی قوت، بہتر حکمت عملی اور تحمل وبُردباری کے مظاہر ہ سے یک طرفہ طور پر تبلیغی جماعت سے اپنے تعلقات بہتر اور مستحکم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کی غیرمعمولی دعوتی مصروفیات کی وجہ سے ان کا خانقاہی نظام اور سالکین کی تربیت کا کام متاثر ہے۔ چونکہ موصوف اکثر دعوتی نقطہ نگاہ سے دوروں میں مصروف رہتے ہیں، اس لئے خانقاہ میں آنے والے افراد کو اکثر دستیاب نہیں ہوتے۔ تاہم یہ بھی مسرت کی بات ہے کہ مولانا نومسلموں کی اخلاقی وروحانی تربیت کے کام میں اپنی ساری توانائیاں صرف کررہے ہیں۔ یہی نومسلم ان کے دعوتی کام کے دست وبازو ہیں، مولانا کے ہاتھ پر مسلمان ہونے والے نومسلم اب تک دنیا بھر میں پھیل چکے ہیں۔

وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں وہاں کے مختلف شعبوں میں اہم حیثیتوں پر فائز ہیں یا انجنیئر ، ڈاکٹر اور ٹیکنیکل ماہر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ ان نومسلموں کی کاوشوں سے دنیا بھر سے روزانہ کئی افراد موبائل کے ذریعہ مولانا سے رابطہ رکھکر مسلمان ہورہے ہیں۔

نومسلموں میں مولانا کی شروع کردہ یہ تحریک ان شاء اللہ ایک طاقتور تحریک کا

روپ اختیار کرے گی، بشرطیکہ نومسلموں کی روحانی واخلاقی تربیت مستحکم بنیادوں پر ہو۔

البتہ مولانا کی یہ بات کہ ہرمسلمان کا بنیادی کام (جو نصب العینی کام کی حیثیت کا حامل ہے) غیرمسلموں میں دعوتی کام کرنا ہے، یہ بات ایسی ہے، جو ہضم ہونے والی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو مسلمان بُری طرح نفس پرستی کی قوتوں کے زیر اثر ہوں اور جو روحانی اور اخلاقی طور پر پست حال ہوں، جو کاروبار اور معاملات میں اسلام سے بغاوت کی راہ پر گامزن ہوں، ان مسلمانوں کا تو پہلا ہدف اپنی اصلاح ہونا چاہئے۔ اس کردار کے ساتھ وہ غیرمسلموں میں دعوتی کام کرکے، انہیں اسلام سے مزید دور کرنے کا موجب ہی ثابت ہوں گے، بلکہ ثابت ہورہے ہیں۔

مولانا کی طرف سے دعوتی کام پر اس قدر غیرمعمولی زور دینا، ایک اعتبار سے شاید مبالغہ میں شامل ہو، سلف میں اسلام کی ترتیب یہی رہی ہے کہ سب سے پہلے اپنی اصلاح، جب اپنی اصلاح کے ذریعہ سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا ہوگی تو اس پاکیزگی کے ساتھ دعوتی کام خیر وبرکت کا باعث ہوگا۔ اور اس کام کے لئے راہیں بھی نکلتی جائیں گی۔

البتہ یہ بات بجا ہے کہ مولانا جیسی طاقتور روحانی شخصیتوں کا ہدف غیرمسلموں میں کام ہی ہونا چاہئے۔

غیرمسلموں میں مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کے بڑے پیمانہ پر ہونے والے کام کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مولانا الیاس رحمتہ اللہ کی شخصیت میں مسلمانوں میں تجدید ایمان کی تحریک کا غیرمعمولی داعیہ پیدا کرکے، ان سے دعوتی محاذ پر بڑے پیمانہ پر کام لیا تھا، اسی طرح کا کام اللہ تعالیٰ غیرمسلموں میں مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب سے لے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں مطلوبہ اور ضروری صلاحیتیں وصفات مولانا میں پیدا کردی ہیں، خون وجگر، ہمت وحوصلہ، بہتر حکمت عملی، فکرمندی، اضطراب، ساری توانائیوں کے استعمال کا داعیہ، دعوتی کام میں فنائیت، خوداعتمادی، آخری حد تک فروتنی وعاجزی، روحانی صلاحیتوں سے بہرہ وری، بڑے بڑے بزرگوں کی دعائیں، ان تھک

جدوجہد، نومسلموں کے ساتھ والہانہ محبت اور ان کی تربیت اور قدم قدم پر ان کی رہنمائی کے لئے فکرمندی، اس کام کے لئے نئی نئی باتوں کا القا ہونا، اسلام کی معمولی طلب رکھنے والے غیرمسلموں کے دل کو مولانا کی طرف متوجہ ہونا اور مسلمان ہونے کے بعد ماں باپ سے زیادہ مولانا سے محبت کرنا اور ان کو اپنے لئے شفیق پانا، اس راہ میں پیش آنے والی ساری رکاوٹوں کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنا، قدم قدم پر اللہ کی مدد ونصرت کا ظہور ہونا، بہتر صلاحیتوں کے نومسلموں کا دستیاب ہونا اور ان میں مولانا کی دردمندی، فکرمندی وفروتنی کے اجزاء کا منتقل ہونا، غرض کہ یہ ساری صفات یااللہ کی مدد کی یہ ساری صورتیں بتا رہی ہیں کہ مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کو اس عظیم کام کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔

یہ غیرمسلموں کی حالت زار پر اللہ کریم کی رحمت کی بڑی علامت بھی ہے کہ مولانا کے ذریعہ یہ کام ایک تحریک کی صورت اختیار کرگیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے کچھ بعید نہیں ہے کہ غیرمسلموں میں کام کی یہ تحریک چند سالوں میں مولانا الیاس رحمتہ اللہ کی تحریک کی طرح عالمی صورت اختیار کر جائے۔

(۲)

حضرت مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کی طرف سے غیرمسلموں میں دعوتی کام پر غیرمعمولی زور دینے، بلکہ اس کام کو امت مسلمہ کے نصب العینی کام کی حیثیت سے پیش کرنے کی وجہ سے ہمارے یہاں بھی بعض افراد میں اس کام کا ذوق وشوق پیدا ہوا اور انہوں نے اپنی ذاتی اصلاح اور کردار میں چمک پیدا کرنے، اپنی شخصیت میں انسانی جوہر پیدا کرنے اور تہذیب نفس کے سلیقہ سے آشنا ہونے سے پہلے ہی یہ کام ہاتھ میں لیا اور اس کے ثبوت کے طور پر مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کی بہت ساری تقاریر پیش کیں کہ مولانا فرماتے ہیں کہ ہمارے کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے۔ مولانا کی تقاریر سے متاثر ہوکر اپنے طور پر یہ کام ہاتھ لینے کا نقصان یہ ہوا کہ وہ غیرمسلموں سے مناظرہ کی راہ پر گامزن ہوئے، اس طرح انہیں اسلام سے قریب کرنے کی بجائے

اسلام سے مزید دور کرنے کا موجب بنے، نیز اس سے ان کے مزاج میں اشتعال کی نفسیات بھی پیدا ہوئی۔ ہم نے ایسے حضرات کو یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب نے لگ بھگ بیس سال تک ایک عظیم مربی اور عظیم داعی کی صحبت اختیار کرکے، ان کے اخلاق عالیہ کو اپنایا، اپنی شخصیت پر ان کی شخصیت کے رنگ کو غالب کیا اور تزکیہ نفس کے فیصلہ کن مراحل سے گزرے، اس کے بعد ہی اللہ نے اپنے فضل سے ان میں یہ استعداد پیدا فرمائی۔

اس کام کی صلاحیت غیرمعمولی ایمانی وروحانی قوتوں کے بغیر پیدا نہ ہو سکے گی، لیکن وہ حضرات مصر تھے کہ چونکہ مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ امت کے لئے سب سے زیادہ کرنے کا کام ہی یہی ہے، اس لئے ہمیں تو بہرصورت یہی کام کرنا ہے۔ چاہے غیرمسلموں سے بحث ومباحثہ اور ضد کی صورت پیدا ہو، ان سے تعلقات کشیدہ ہوں، یہ بات حضرت محمد کلیم صدیقی صاحب کی شخصیت کے ملاحظہ کے لئے پیش کی گئی ہے کہ وہ دعوتی کام کی فیصلہ کن اہمیت بیان کرتے وقت اس نکتہ کو ضرور پیش نظر رکھنا فرمائیں کہ کہیں اس سے افراد، تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کے کام سے صرف نظر کرکے، اس کام ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لیں۔ اس طرح ان سے نہ تو دعوتی کام ہو سکے اور نہ ہی وہ اصلاح نفس کے کام کی طرف رجوع ہوسکیں۔

ہماری نظر میں مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کو اسی کام کے لئے کھڑا کیا گیا ہے اور اس کی کام کی اہلیت وصلاحیت عطا فرمائی گئی ہے، اور ان کی شخصیت میں وہ خصوصیات وصفات پیدا کی گئی ہیں۔ اب وہ افراد (جو تزکیہ نفس کے فقداں کا بھی شکار ہوں) اور اس کام کو زندگی کے ہدف کے طور پر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں مولانا کی تحریک کا حصہ بننا پڑے گا اور مولانا سے تربیت حاصل کرکے، اسی کام کو ہاتھ میں لینا ہوگا۔ اپنے طور پر ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو سکے، مشکل ہے۔

''نسیم ہدایت کے جھونکے'' کتاب کے آخر میں مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب کا مختلف مسائل پر تفصیلی انٹرویو بھی شایع ہوا ہے۔ اس انٹرویو میں اس دعوتی کام کے ابتدا اور اس کی صورت، اس کام کی اہمیت، دعوتی محاذ پر ہونے والے دوسرے کاموں کے

بارے میں مولانا کی روادارانہ اور خوش دلانہ ادائیں، اور امت کے مسائل پر مولانا کا معتدانہ نقطہ نگاہ کافی تفصیل سے سامنے آیا ہے، اس انٹرویو کی اہمیت کے پیش نظر یہاں ہم اس کے کچھ حصے پیش کر رہے ہیں۔

سوال: حضرت مولانا سے آپ نے استفادہ کیا اس کے سلسلہ میں کوئی خاص بات فرمائیں؟

جواب: اس کے لیے محبت اور مناسبت دوچیزیں ضروری ہیں۔ میرے اللہ نے مجھے دونوں چیزوں سے نوازا، محبت کا تو یہ حال تھا کہ ایک خط میں حضرت کے یہاں لکھ کر رکھ کر آتا، اور پھر آتے ہی خط لکھا ،۲۳ سالہ تعلق میں ایک تہائی وقت اس حقیر کا حضرت کی خدمت میں آنے جانے میں ضرور گزرا ہوگا۔ چار سو بتیس خطوط حضرت والا کے الحمدللہ میرے پاس ہیں اس کے باوجود بھی میں بے قرار رہتا تھا، مناسبت کا یہ حال تھا کہ حضرت کی طرف سے عام اصول اصلاح کے خلاف مختلف بزرگوں کے یہاں جانے کا حکم ہوتا تھا، کسی بھی اللہ والے کے یہاں حاضر ہوتا تو ایک بزرگ کی عقیدت کم ہونے کے بجائے کچھ نہ کچھ بڑھتی تھی، مگر ساتھ ساتھ زبان حال سے یہ کہتا ہوا نکلتا:

آفاقہا گردیدہ امٗ مہر بتاں ور زیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت والا کی صحبت بابرکت سے جو چیز اس حقیر کو ملی وہ اپنی ناکارگی کا احساس، بعض مرتبہ تو حد درجہ یہ احساس مغلوب کردیتا تھا کہ حضرت والا اکثر خطوط میں تحریر فرماتے، زبانی بھی فرماتے، تمہارے حالات پڑھ کر اپنے حال پر شرمندگی ہوتی ہے، اللہ نے کیسے احوال سے نوازا ہے، مگر اس طرح کے جملوں کو پڑھ کر حد درجہ شرمندی ہوتی، کہ اس مقام اور منصب پر فائز ہوکر یہ شیخ العرب والعجم اپنے کو کیا سمجھتے ہیں اور ہماری کیا حیثیت ہے، اور شرم سے پانی پانی ہونے کو جی چاہتا، محسنین کے لیے جذبہ احسان مندی سیکھنے کی حسرت بھی دل میں بہت بڑھی۔ (صفحہ۶۰۷ تا ۷۰۷)

سوال: دعوت کے سلسلہ میں کام کی شروعات کس طرح ہوئی؟ پہلے ایک زمانہ

تک ارتداد زدہ علاقہ میں آپ نے کام کیا پھر کس طرح عام غیرمسلموں میں آپ نے کام شروع کیا؟

جواب: اب تم صحیح موضوع پر آئے ہو، میرے حضرت والا (مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) کو کسی طرح خبر ہوئی کہ سونی پت کے قریب تقسیم ملک اور تبادلہ آبادی کے وقت فسادات سے متاثر ہو کر خاصے لوگ مرتد ہوگئے تھے۔ حضرت والا نے کام کرنے والوں سے تعاون بھی کیا، اور مجھے حکم فرمایا کہ صحیح صورت حال معلوم کرو، سونی پت ہم سے قریب تھا، ہم نے کچھ رفقاء کو لے کر سفر کیا، دل ودماغ مندروں اور گرد واروں، اور جانوروں کی رہائش گاہوں میں بدلی ہوئی مسجدوں کو دیکھ کر نیم پاگل ہوگیا، حضرت سے صورت حال عرض کی، حضرت نے کام کا حکم فرمایا، دوسال تک ہم لوگ سروے کرتے رہے اور کوشش کرتے رہے، ۹۰ء میں ایڈوانی جی کی رتھ یاترا کے دوران ہمارے دو ساتھی ماسٹر ضیاء الدین بجنوری اور حافظ نسیم دیناج پوری کو علاقہ کے ایک بڑے ڈاکوؤں کے سردار نے ایک مسجد میں شہید کر دیا، اور دریا میں ڈال دیا، بعد میں ان چار قاتلوں میں سے تین لوگ گویا خواب میں جناب ضیاء الدین کی دعوت پر مشرف باسلام ہوئے۔

ان دونوں کی شہادت کے بعد الحمدللہ ارتداد سے متاثر علاقہ میں فتوحات کے دروازے کھلے، میرے حضرت والا اس علاقہ میں کام کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے، دومرتبہ فرمایا کہ سونی پت میں جنت اور اللہ کی رضا بڑے سستے داموں مل رہی ہے، بے حد دعائیں فرماتے، اللہ نے ہریانہ پھر پنجاب، راجستھان، متھرا، آگرہ، دہلی اور ہما چل وغیرہ میں کام کی شکلیں بنائیں، اسکول کے نام پر مدارس قائم کرنا۔ اس علاقہ میں کام کے لیے سب سے مناسب راستہ تھا، اللہ کا شکر ہے کہ بستیاں کی بستیاں تائب ہوکر میرے حضرت والا کی برکت سے واپس اسلام میں آئیں، اصل میں جب شروع میں حضرت نے مجھے حکم دیا تھا تو میں خود حیرت میں تھا، مجھ جیسے گنوار کو ایسا حکم کیوں دے رہے ہیں، مگر حضرت رائے پوریؒ کا ایک ملفوظ سنا تھا کہ ارادت کا مزا فٹ بال بن جانے میں ہے، اس ملفوظ نے رہنمائی کی اور ہمت بندھائی، اور پھر فٹ بال بن

جانے کی برکات کھلی آنکھوں دیکھنے کو ملیں۔ (نسیم ہدایت کے جھونکے، صفحہ۷۰۸)

سوال: غیرمسلموں میں دعوت کا کام کس طرح شروع کیا؟ اور اس کام میں کس طرح اللہ نے لگایا؟

جواب: اصل میں اس کام میں لگنے کے دواسباب ہیں، ایک ظاہری سبب اور ایک حقیقی سبب، حقیقی سبب تو یہ ہے کہ میرے حضرت والا کی والدہ ماجدہ حضرت خیر النساء صاحبہ ایک بڑی مستجاب الدعوات ولیہ خاتون تھیں، انہوں نے میرے حضرت والا کے لیے بہت دعائیں مانگیں، جس میں یہ دعا سب سے زیادہ مانگی کہ علی تمہارے ہاتھوں پر جوق درجوق لوگ اسلام قبول کریں، یہ دعا حضرت کے لیے قبول ہوئی، اور یہ بالواسط اس حقیر کے حصہ میں آئی، میرے حضرت والا نے چھ سات خطوط میں اس حقیر کو لکھا بھی، دوبار زبانی بھی فرمایا، ایک بار بوانہ دہلی میں چار ہزار میراثی مرتد مردوں، عورتوں نے رات کے ایک بجے اجتماعی طور پر ارتداد سے توبہ کرکے تجدید ایمان کی تھی، اور ڈھائی بجے رات تک نام بدلو آنے آئے، یہ حقیر بہت خوش تھا، اس بڑی تعداد میں تجدید ایمان کا یہ پہلا موقع تھا، خواب دیکھا کہ حضرت کی والدہ ماجدہ ایک تخت پر تشریف فرما ہیں، جیسے کوئی ملکہ تاج پہنے ہوئے ہو، اس حقیر نے سر پر ہاتھ رکھنے اور دعا کی درخواست کی، تو کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا، کیا سمجھتے ہو، یہ سب دعوتی فتوحات میری دعا کی قبولیت ہیں، اس حقیر نے خواب حضرت والا کو لکھا، تو حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا، ہماری والدہ ماجدہ ہمارے لیے سب سے زیادہ یہ دعا کرتی تھیں کہ علی میاں، تمہارے ہاتھوں پر لوگ جوق در جوق اسلام قبول کریں، یہ دعا الحمدللہ واسطہ سے تمہارے لیے قبول ہوئی ہے، اس حقیر کا تجربہ ہے کہ کئی حضرات دعوت کا کام دیکھنے اور جڑنے کے لیے آئے، کئی لوگ تو سالوں رہے، مگر کوئی آدمی ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام نہیں ہوا، بلکہ بعض لوگوں کے ساتھ تو یہ بھی ہوا کہ لوگ ازخود اسلام قبول کرنے آئے، مگر انہوں نے کلمہ نہیں پڑھایا، اور حضرت مولانا کے سلسلہ میں شامل ہوئے، تو لوگ مشرف باسلام ہونے لگے، تو اصل وجہ اس کام کی میرے حضرت والا اور حضرت کی والدہ ماجدہ کی دعائیں ہیں، میرے حضرت والا نے بھی اس حقیر کے لیے بہت

دعائیں کی ہیں، ایک سال پورا رمضان اجتماعی دعاؤں میں نام لے کر دعائیں کیں، اور حضرت فرماتے تھے کہ بلاناغہ وظیفہ سمجھ کر نام لے کر تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔

دوسرے کام سے لگنے کا ایک ظاہری سبب بھی ہوا ہے، یوں تو جس لائین میں جانا ہوتا ہے، کچھ نہ کچھ آثار پہلے سے آنے لگتے ہیں، بچپن سے لے کر کئی لوگ، ایک کمہار کا لڑکا، ایک کلاس فیلوارم اور چند اور لوگ ایسے ہیں جو اس حقیر کو ذریعہ بنا کر مسلمان ہوئے، مگر اس کام کی طرف توجہ کا ذریعہ اس حقیر کی بچی اسماء ہوئی، اور اس واقعہ کو میرے حضرت والا نے بھی کئی بار تقریروں میں بیان کیا۔

ہوا یہ کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو جب ایڈوانی کی رتھ یاترا رام مندر کی تحریک چل رہی تھی، چاروں طرف دردناک فسادات ہونے شروع ہوگئے، ستمبر کے مہینہ میں ہمارے یہاں ایک صفائی کرنے والی آتی تھی، بالا اس کا نام ہے، صاف ستھری رہتی ہے، بچے اس سے مانوس رہتے ہیں، میں ایک کمرے میں کسی کتاب کا مطالعہ کررہا تھا، میری بچی جس کی عمر اس وقت آٹھ سال رہی ہوگی، وہ اس گیلری میں جہاں وہ بارش کی وجہ سے کچرے کا ٹوکرا رکھ کر بارش کے رکنے کا انتظار کر رہی تھی، اس سے رازدارانہ انداز میں بات کرنے لگی، مجھے خیال ہوا کہ ماحول خراب ہے، نہ جانے کیا بات کہہ دے، اور یہ کیا لگا دے، میں سننے لگا، اسماء نے بالا سے کہا: بالا، تم کتنی اچھی ہو، اور اچھی ہوجاؤنا، بالا نے کہا: کس طرح سے؟ اسماء نے کہا: بالا، تم کس کی پوجا کرتی ہو؟ اس نے کہا بھگوان کی مورتی کی، اسماء نے کہا: بالا، یہ مورتی تمہیں کچھ دے دے گی کیا؟ یا نفع ونقصان پہنچا دے گی، مجھے تو یہ ڈر ہے کہ بالا تم ہندو کی حیثیت سے مرگئی تو تم دوزخ میں جلوگی، بالا، تم کس طرح دوزخ کی آگ برداشت کروگی، میں تصور نہیں کرسکتا تھا کہ ایسی چھوٹی بچی قرآنی انداز میں اس کو دعوت دے سکتی ہے، میں بے اختیار باہر نکل آیا، بالا، مجھے دیکھ کر چلی گئی، میں نے دیکھا اسماء کی آنکھوں میں آنسو ہیں، میں نے محبت سے اس سے سوال کیا، اسماء بالا سے تم کیا بات کررہی تھیں، وہ بولی یہ کتنی اچھی ہے، بالا ہم سے کتنی محبت کرتی ہے، یہ دوزخ میں جلے گی، ابی جی کتنی تکلیف ہوگی، یہ کہکر میرے سینہ سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی، قرآن مجید ایک زمانے سے پڑھتا

تھا، فورا جیسے کسی نے اندر سے کہا ہو:

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُونُوا مُؤْمِنِیْنَ. (سورہ الشعراء، آیت۳)

(ترجمہ: شاید آپ خود کو ہلاک کر لیں گے اس غم میں کہ یہ لوگ مومن کیوں نہیں ہوتے) پوری سیرت پاک ایک ویڈیو کی طرح دل دوماغ کے سامنے آگئی، کہ ہم صرف جوتا داہنے پاؤں میں پہن کر، میٹھا اور کدوکھا کر متبع سنت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اصل سنت تو یہ نبوی درد ہے، جو ایک لمحہ پیارے نبی سے وصال تک غائب نہیں ہوا، اس کے بغیر کیسے ہم رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہو سکتے ہیں۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکی کا ایک ملفوظ بارہا پڑھا تھا، یاد آیا، حضرت تھانوی راوی ہیں کہ حضرات علماء کی موجودگی میں ایک بار فرمایا: بھائیو، قطب بننا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا ضرور، حضرت نے فرمایا، قطب بننے کا ایک آسان نسخہ بتاتا ہوں، جب کوئی غیرمسلم مرجایا کرے تو تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر رولیا کرو، کہ ہمارا بھائی ہمیشہ کی دوزخ میں چلا گیا، ہم نے کچھ فکر نہ کی، قطب بن جاؤ گے۔ خیال ہوا کہ قطبیت وراثت نبوت ہے، وارث نبی وہ ہوسکتا ہے، جو وارث درد نبی ہو، دل ودماغ پر سکتہ طاری ہوگیا، اگلے روز ہریانہ سونی پت جانا تھا، ایک نوجوان بہت محبت کرتا تھا، فورا آ گیا۔ ایک پجاری کا بیٹا راج کمار میں نے اس سے کہا، بیٹا راج کمار، تم اتنی محبت کرتے ہو، یہ محبت کچھ کام نہیں آئے گی، جب تک کلمہ نہ پڑھ لو، آٹھ نومنٹ اسے اسلام وایمان بتایا، وہ کلمہ پڑھنے کے لیے تیار ہوگیا، اور کلمہ پڑھ لیا، ایک شرماجی آنے تھے، وہ آگئے، وہ بھی تھوڑی دیر میں ایمان کے لیے تیار ہوگئے، شام کو ایک گاؤں میں پروگرام تھا، وہاں ایک گاڑی میں تیسرا آدمی پھونک لگوانے کے لیے آیا، اس کو سمجھایا، وہ بھی مسلمان ہوگیا، ذرا سی دیر میں تین لوگ جہنم کی آگ سے بچ گئے، اس نے اور بھی جھنجھوڑ دیا، اور پھر قرآن وسیرت پڑھنا شروع کیا، اور کہنا شروع کیا تو لوگ کھڑے ہوتے گئے۔

اس کے بعد بھی کئی بار جذبہ میں تحریک پیدا کرنے کے لیے اللہ نے اسماء کو ذریعہ بنایا، دوتین سال کے بعد شعبان میں کچھ مدرسے والوں کو تصدیقات دینے کے لیے گھر میں لیٹر پیڈ لینے کے لیے آیا، اسماء آئی، بولی، ابی جی مجھے آپ سے ضروری

بات کرنی ہے، اور چھ مہینہ ہو گئے، آپ کے پاس ہمارے لیے وقت ہی نہیں ہے، اسماء کی یہ بات دل کو بہت ہی لگی، میں نے جذباتی انداز میں اس سے کہا، بیٹا بات کرلو، ابھی کرلو، وہ بولی مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے، میں بہت پریشان ہوں، مجھے اطمینان کا وقت چاہیے، میں نے کہا ابھی بات کر لو، اس نے کہا، اب تو آپ باہر مہمانوں کے پاس جارہے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، تم خوب اطمینان سے بات کرو، ایک دو دن میں تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ وہ بولی، ابی بتایئے، یہ کافر، مشرک اور سارے غیرمسلم ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے؟ میں نے کہا، ہاں ہمیشہ جلیں گے، وہ بولی، ابی ہمیشہ نہیں جلیں گے، دوسال، تین سال، سوسال، دوسوسال، اللہ میاں کہہ دیں گے چلو جاؤ بس معاف کر دیا، میں نے کہا: نہیں، وہ ہمیشہ جلیں گے، اللہ نے اپنے کلام میں فرما دیا ہے، وہ بولی، فرما دیا ہو، یا نہ فرما دیا ہو، مگر اللہ ان کو ہمیشہ نہیں جلائیں گے، اللہ کا نام رحمٰن ورحیم ہے، ماں سے ستر گنا مامتا رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ چلو چلو، بس میں نے معاف کیا، سو سال، دوسو سال، پانچ سو سال میں اللہ میاں سب کو نکال دیں گے، میں نے کہا اللہ تعالیٰ جھوٹ تھوڑی بولتے ہیں، اللہ نے اپنے کلام میں صاف صاف فرمادیا ہے۔

إِنَّ اللّـهَ لاَ يَغْفِـرُ أَن يُشْـرَكَ بِـهِ وَيَغْفِـرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَـاءُ. (سورہ النسآء: آیت ۴۸)

(ترجمہ: بلاشبہ اللہ شرک کو معاف نہیں کرتا اس کے علاوہ جسے چاہیں گے ہر گناہ کو معاف کردیں گے۔)

اب اسے عربی کی شدبد ہوگئی تھی، بہت مایوس ہوئی اور بولی، ابی اس میں ان کی کیا خطا ہے، ہمارے اللہ میاں نے ہی تو ان کو ہدایت نہیں دی۔ تقدیر کے معاملے میں اتنی ننھی بچی سے کیا بات کرتا، بات کے رخ کو پھیرنے کے لیے میں نے اس سے کہا کہ اللہ کا شکر کرنا چاہیے، کہ اللہ نے تمہیں تو ہدایت دی ہے، وہ بہت غمگین ہوئی اور پھوٹ کر رونے لگی، ابی میرے دل میں آتا ہے کہ ''میرے اللہ کسی کو دوزخ کی آگ میں نہ جلائیو، بس سب کے بدلہ مجھ اکیلی کو جلالی جیو، اس حقیر کے پورے وجود کو اس

معصوم کی کیفیت نے جھنجھوڑ دیا، اور مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے۔ ''مجھ اکیلی کو جلا لیجیے'' یہ تو اس بچی کی ناسمجھی ہے، مگر کوئی دوزخ میں نہ جلے، یہ ہمارے نبی ﷺ کا سب سے بڑا درد ہے، جس کے بغیر کوئی مومن رحمتہ اللعالمین نبی کا پیرو ہرگز نہیں ہو سکتا، اس کے بعد بھی اس بچی نے دعوتی جذبہ کو تحریک دی۔ اس طرح ظاہری اسباب کے طور پر وہ بچی میری استاذ ہے۔ (صفحہ نمبر ۷۰۸ سے ۷۱۲)

یہاں پر کسی داعی اور خیر خواہ کی مخالفت کی کوئی نظر پورے ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہم لوگ اپنے رفقاء کے ساتھ اب تربیتی کیمپوں کا سلسلہ تقریبا پانچ سال سے چلا رہے ہیں، ایک بھی واقعہ ایسا نہیں کہ کسی نے مخالفت کی ہو۔ جس کو دعوت دی گئی ہے، اس نے ذرا اف کیا ہو، بلکہ مندروں میں، مذہبی تنظیموں کے دفتروں، تھانوں میں ہمارے دعاۃ جاتے ہیں، سب جگہ سے احسان مندی کے جذبات سامنے آتے ہیں، انکوائریاں آتی ہیں، کچھ لوگ جن کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب بدلوا رہے ہیں۔ ناراض ہوتے ہیں، مگر جب محبت سے دعوت دی جاتی ہے، وہ لوگ مشرف باسلام ہوتے ہیں۔ کتنے واقعات ''ارمغان'' میں آچکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خطروں اور خوف سے بچنے کا نسخہ خود اپنی بیاض قرآن کریم میں دعوت کو قرار دیا ہے۔

الَّـذِيـنَ يُبَـلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَداً إِلَّا اللَّهَ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيباً. (سورہ احزاب:۳۹)

(ترجمہ: جو لوگ تبلیغ رسالت کا کام انجام دیتے ہیں، وہ اسی سے ڈرتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ، اور اللہ ان کے حساب کے لیے کافی ہے۔)

وَاللّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

(اور اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت فرمائے گا) کا وعدہ بھی اللہ نے کیا ہے۔ (صفحہ ۷۱۵)

سوال: دوسری تنظیموں اور دعوتی تحریکوں کے ساتھ دعوتی اشتراک کے بارے میں لوگ کہتے ہیں، ان کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

جواب: اس حقیر نے اپنے رفقاء کے لیے خطوط متعین کرنے کے لیے ایک مضمون جمعیت امام ولی اللہ کے تعارف کے ساتھ چھپوایا تھا، جس کا عنوان تھا: ''دین کے ہر کام کرنے والے کے رفیق بنو، فریق نہیں'' الحمد اللہ ہم لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں، کہ ہم رفاقت کی شناخت کے ساتھ کام کریں۔

سوال: تبلیغی جماعت کے ساتھ آپ کا معاملہ کیا ہے؟

جواب: یہ حقیر دعوت کی اس ٹوٹی پھوٹی محنت کو جو غیر مسلموں میں چل رہی ہے، اکابرین تبلیغ کے نشانوں اور خوابوں کی تعبیر سمجھتا ہے، اپنے کاموں کی جو ''الف با'' حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے شروع کی تھی، اس کی ''ت ث'' اس کوشش کو سمجھتا ہے، تاہم مرکز کا ایک نظام ہے، جب تک وہاں سے خود اس کا مشورہ نہیں ہوتا، انفرادی طور پر کوشش کرنے کی ترغیب کو مناسب سمجھتا ہے، اور صد فیصد یقین بلکہ یقین کامل ہے کہ بنگلہ والی مسجد سے جو آواز چلی ہے، دنیا کے ہر کونے کے ہر انسان تک ایمان پہنچانے کی آواز ہے، جو انشاء اللہ اسی مرکز سے دنیا میں پہنچے گی، یہ حقیر بھی اس تحریک کا جاروب کش ہے، یہ توفیق صرف تبلیغی کوششوں کے صدقے میں ملی ہے۔

سوال: دینی مدارس اور تعلیمی تحریکوں کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: دین کا اہم ترین متبع مدارس ہیں، نبی کریم ﷺ معلم بنا کر بھیجے گئے تھے، تبلیغ، تعلیم کا ایک شعبہ ہے، اور ہمارے لیے معیار، نبوی مدرسہ صفہ ہے، جس کے متعلمین کے واسطے سے ساری دنیا میں اسلام پہنچا دے، الحمدللہ ہم لوگ مدارس اور اہل مدارس کی خدمت کو سعادت سمجھتے ہیں، اور مدارس کا دعوتی مزاج بنانے کی کوشش کرتے ہیں، مدارس کے خلاف مسلمانوں میں غلط فہمی، بدگمانی کو یہ حقیر ملت اسلامیہ کی خودکشی سمجھتا ہے، اس کے لیے ''دینی مدارس ہماری ذمہ داری اور ملک کی ترقی میں مدارس کا رول'' میرے مضامین انٹرنیٹ پر ہیں، وہ پڑھنے کے ہیں، یہ حقیر دینی مدارس میں جاتا ہے، لوگ از راہ کرم معائنہ کے لیے کہتے ہیں، تو یہ حقیر اپنا منصب بڑے فخر سے خاک پائے خدام دین لکھتا ہے، کسی انکساری یا تواضع کے جذبہ سے نہیں، بلکہ اس امید پر کہ اللہ کا کوئی بندہ معائنہ کے رجسٹر کو پڑھے گا تو کسی مقبول گھڑی میں یا مقبول بندہ کی زبان سے نکلنے کی وجہ سے

اللہ تعالیٰ ''خاک پائے خدام دین'' بنا دیں گے تو میری آخرت بن جائے گی۔

سوال: نومسلموں کے مسائل کے سلسلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اصل میں نومسلم کی اصطلاح خیر القرون میں نہیں تھی، مجھے لگتا ہے کہ ہر چیز کو خیر القرون سے لینے کا مزاج ہی ہمارے لیے خیر کا ضامن ہے، ہمارے رفقاء اپنے دعوتی مرکز قائم کرتے ہیں تو دارارقم اور بعد میں دار ابو ایوب نام رکھتے ہیں، اس حقیر نے اس کی بڑی برکت محسوس کی، اگر ہم ان لوگوں کو مہاجر بھائی کہیں تو انشاء اللہ بڑی خیر ہوگی۔

الحمدللہ! ارمغان کے حوالہ سے کب سے یہ بات کہی جاتی رہی ہے اور قرآن وسنت اور تاریخ کے حوالوں سے ثابت کی جاتی رہی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری دنیائے انسانیت کے سارے انفرادی، اجتماعی، سیاسی، معاشرتی، معاشی ہر طرح کے مسائل کا حل سیرت نبوی کی روشنی میں صرف دعوت ہے اور دعوت ہی ان مسائل کا حل ہے اور آسان ترین حل ہے، اور دعوت کی راہ میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں، ان میں دنیا کے ہر داعی کا تجربہ ہے کہ دعوت کی راہ میں ایک اہم ترین مسئلہ اسلام قبول کرنے والے ان نومسلموں کا مسئلہ ہے، جن میں سے اکثر کو ہجرت کرنا پڑتی ہے، ان خوش قسمت افراد کے، (جن کو اللہ تعالیٰ اپنی شان ہادی کے مظہر کے طور پر ہدایت یاب فرما رہے ہیں) ان کے تربیتی، اقتصادی، اور معاشرتی مسائل سے دعوت کا کام کرنے والے افراد بہت جڑتے ہیں، لوگ جماعت میں بھیجتے ہیں، مدارس میں رکھتے ہیں، اس کے لیے ادارے تربیتی مراکز قائم کررہے ہیں، اس سلسلہ میں کوششیں کی جارہی ہیں، مگر بظاہر حق ادا تو کیا، بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو پاتا۔

پوری دنیا کے داعیوں کا تجربہ ہے کہ اگر اسلام قبول کرنے والا مہاجر نومسلم تربیت کے ساتھ اقتصادی اور معاشرتی طور پر سیٹ ہوجائے، اس کے پاس ایسا نظم ہو کہ وہ اپنے گھر والوں، خاندان والوں اور عزیزوں کو اپنے گھر چند روز مہمان رکھ سکے تو رفتہ رفتہ اس کے اہل خانہ، بھائی بہن، ماں باپ، اسلام میں آجاتے ہیں، اس کے برخلاف اگر وہ در در پھرتا رہے اور اپنی ضروریات کے لیے سوال کرتا پھرے، تو پھر وہ

دوسروں کو دعوت دینے کی ہمت تو کیا کرتا، خود آنے والوں کے لیے رکاوٹ بنتا ہے، ہم لوگ اپنے خاندان اور گھر میں رہ کر ایک مہاجر نومسلم بھائی کے درد اور حال کو نہیں سمجھ سکتے۔ (صفحہ۱۶ے سے ۱۸ے)

ان مہاجروں کے تربیتی معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا حل جب ہم صراط مستقیم، اسلام کے دروازے پر سیرت نبویﷺ کی روشنی میں تلاش کرنے نکلتے ہیں تو اس کا ایک مکمل اور آسان ترین حل ہمیں ''اسلامی مؤاخات'' میں ملتا ہے، جو اس زمانہ میں متروک سنت ہوگئی ہے۔ یہ اس مسئلہ کا ایک پائیدار، مکمل اور آسان ترین حل ہے۔

کسی بین الاقوامی ایسی تنظیم کے پاس، جس کو بڑے اہل خیر بلکہ حکومت کی سرپرستی حاصل ہو، اگر پانچ سو مہاجر افراد اچانک آجائیں تو آپ ان کی تربیت، شادی بیاہ، اور کاروبار کے مسائل کے لیے جو کچھ بھی کریں گے، مگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، اس کے برخلاف سیرت نبویﷺ کی روشنی میں مؤاخات کی متروکہ سنت کو زندہ کرکے صرف ہندوستان میں ایک کروڑ مہاجرین ہمارے یہاں ہجرت کرکے آجائیں، ایک کروڑ مسلمانوں سے ان کی مؤاخات قائم کرکے، اس مسئلہ کو چٹکیوں میں حل کیا جا سکتا ہے، ایک مہاجر بھائی کو ایک مسلمان کا بھائی، بیٹا بنا کر اس کی تربیت، اس کی شادی بیاہ، اس کے کاروبار کا مسئلہ حل کرنا بہت آسان ہے، کسی کے چار بیٹے ہیں، اگر وہ ایک مہاجر کو اپنا بیٹا بنا کر چار کے بجائے پانچ بیٹوں کی پرورش، تربیت اور شادیاں اور ان کے پیروں پر کھڑے کرنا کا مسئلہ حل کرنا چاہے تو بغیر کسی بڑے بوجھ کے یہ مسئلہ حل ہوجائے گا اس طرح ایک کروڑ لوگ ایک دو سال میں پرانے مسلمانوں سے اچھے مسلمان بن کر، اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنے گھر والوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بننے کے قابل ہو سکتے ہیں اور پھر یہ ایک کروڑ چند سالوں میں دوسرے کئی کروڑ کے ساتھ مؤاخات کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ (صفحہ نمبر۱۹ے)

ایک علاقہ میں ایک ہندو بچہ مسلمان ہوا، جس سے وہاں فضا میں تلخی پیدا ہوئی۔

سرپرستی کرنے والوں کے خلاف بھی غم وغصہ ظاہر کیا، علاقہ کے لوگوں نے مسلمانوں پر چڑھائی کا پروگرام بنایا، اس حقیر کے پاس مسلمانون کے فون آئے، اس

حقیر نے عرض کیا کہ میرے اللہ کا وعدہ ہے: **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.** (اور اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت کرے گا) اور **وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا.** (اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے) آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ کچھ نہ ہوگا۔

کچھ لیڈروں نے درمیان میں پڑکر معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا، جب بچے کو بہت مضبوط دیکھا کہ وہ مرنے کے لیے تیار ہے، مگر اپنے گھر کفر میں جانے کو تیار نہیں، تو سب لوگ غصہ میں چھوڑ کر چلے گئے، ایک اپنے سیکولر ہونے کا خبط رکھنے والے مسلمان لیڈر جو دین داری سے دور بلکہ دین داری سے متنفر تھے، بس عید کی نماز بھی رسما پڑھتے تھے، انہوں نے اس معاملہ میں خاص دلچسپی دکھائی، اس حقیر نے ان کو بلایا۔ معلوم کیا کہ ان کے کتنے بیٹے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ چار ہیں، میں نے کہا کہ چار کم ہیں، آپ کا پانچواں بیٹا یہ نومسلم بچہ ہے، یہ سب کچھ چھوڑ کر آیا ہے، اس کو کون گلے لگائے گا، وہ جذبہ میں آئے اور بولے، یہ میرا پانچواں نہیں، بلکہ پہلا بیٹا ہے۔ یہ چاروں بعد میں ہیں۔ الحمدللہ، انہوں نے اس بچہ کو مدرسہ میں داخل کرایا، یہ بچہ حافظ ہو کر اب عالم ہونے والا ہے، اب ان صاحب کا حال یہ ہے کہ گھر کے سب افراد حج کر آئے ہیں، بیٹوں اور ان کے چہروں پر داڑھیاں ہیں، گھر کے سب مرد اور عورتیں نمازی ہوگئی ہیں اور کچھ تہجد گزار بھی۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں، ایک خاندان اگر اپنے گھر میں ایک فرد کو اپنے خاندان کا حقیقی فرد بنا کر اس کی تربیت، اس کی شادی بیاہ اور کاروبار کے مسئلہ کو حل کرنا چاہے تو کتنا آسان ہے۔ (صفحہ۲۰ے)

سوال: دنیا کے دوسرے ملکوں میں دعوت کو پھیلانے کے لئے آپ کیا کررہے ہیں؟

جواب: اصل میں ہم کس کھیت کی مولی ہیں، جو کچھ کرسکیں، اتری ہوئی ہدایت کو تلاش کرکے، اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کررہے ہیں، تین سفر حرمین شریفین کے کرتے ہیں، دنیا سے آنے والے لوگوں کی ذہن سازی کی کوشش سے الحمدللہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں کام پھیل رہا ہے، عربی کا پرچہ ''الخیر'' بھی دعوتی ذہن سازی کے

لئے نکل رہا ہے، انگریزی میں بھی کوشش چل رہی ہے، الحمدللہ لوگ کھڑے ہورہے ہیں،خصوصا ''ارمغان'' کی آواز تو دنیا کے کونے کونے تک پہنچ رہی ہے۔ (صفحہ۲۱۷)

سوال: ذرائع ابلاغ جیسے ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ کو دعوت کے لیے استعمال کرنا کیسا ہے، موجودہ زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر نائک پیس ٹی وی کے ذریعہ جو کام کررہے ہیں، اس طریقہ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ذرائع ابلاغ کو یہ حقیر ذرائع تبلیغ ہی سمجھتا ہے اور ذرائع ابلاغ کی اس کثرت کو ہر کچے پکے گھر میں اسلام پہنچانے کے لیے اللہ کی طرف سے انتظام سمجھتا ہے، ان کو استعمال کرنا چاہیے، اور جن لوگوں کو یہ ذرائع مہیا ہیں، ان کی قدر کرنا چاہئے، ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب اور ان کے طریق پر دعوت کا کام کرنے والوں کی کوششوں کا یہ حقیر قدردان ہے، جہاں تک ہمارے دردمند علمائے کرام کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر نائک اور ان جیسے دعاۃ ..... توجہات صرف دعوت الی اللہ یک طرف مرتکز کرنے اور مسلک ومشرب کی دعوت سے بچنے کی مثبت اور دردمندانہ مشورے کی بات ہے، یہ حقیر بھی اپنے ان خیر خواہوں کی تائید کرتا ہے، تاہم یہ بات ضرور ہے کہ ان کے کام کی افادیت سے انکار کو مناسب نہیں سمجھتا، اس حقیر کی ہر جگہ پر کچھ نہ کچھ غیرمسلم بھائیوں سے ملاقات ہوجاتی ہے، جو پیس ٹی وی دیکھ کر متاثر ہوئے اور اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کیا ، اور ان میں سے بعض لوگ کسی دوسرے واسطہ سے مسلمان بھی ہوئے ہیں، ان ذرائع ابلاغ کو جائز حدود میں استعمال کرنا چاہئے، نئی نسل میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بنیادی غلط فہمیاں مثلا: تلوار کے زور سے اسلام پھیلا، اسلام میں تعداد ازدواج کے سلسلہ میں کافی حد تک ختم ہوتی جارہی ہیں، یہ ان لوگوں کے کام کی افادیت ہے جس کی قدر کرنی چاہئے، تاہم اگر کوئی شرعی قباحت ہے تو مثبت انداز سے اس کو دردمندی سے اپنا سمجھ کر دور کرنے کی کوشش ضرور ہونی چاہئے۔ (صفحہ۲۲۳)

سوال: بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ کلمہ پڑھوانے سے کیا ہوتا ہے؟

جواب: یہ بات یہ حقیر ہر جگہ ذکر کرتا ہے اور بالکل اظہار حقیقت کے طور پر ذکر کرتا ہے کہ یہ حقیر دعوت کی الف با بھی نہیں جانتا، تربیتی کیمپوں کا یہ سلسلہ چل رہا ہے، اس حقیر کو اس میں شرکت کر کے کچھ دعوت سیکھنے کا موقع نہیں ملا، بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ فضول شہرت ہوجانے کی وجہ سے لوگ اس حقیر کو ملواتے ہیں، تو میں آپ لوگوں میں سے کسی تربیت یافتہ داعی کو تلاش کرتا ہوں، جب کوئی نہیں ہوتا تو مجبورا بات کرنی پڑتی ہے، اب جب یہ حقیر کچھ جانتا ہی نہیں تو ''پڑھ کلمہ'' کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے، یہ حقیر ایک لطیفہ عرض کیا کرتا ہے کہ ایک خانصاحب ایک سردار جی نے جان کے خوف سے کہا پڑھاؤ تو خان صاحب بولے، ہم کو بھی یادنہیں، سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ کچھ آتا بھی نہیں، اس لیے باقاعدہ دلائل کے ساتھ دعوت دے نہیں سکتے، پھر اس کمزوری کو ظاہری مناسب ہوگئی، آقا کے فرمان سے کہ : قولو لا الہ الا اللہ تفلحو، تو ہمارے تو مزے ہی آگئے، پھر اس طرح ''پڑھ کلمہ'' سے کتنے لوگوں کی زندگیاں کیسی قابل رشک بن گئیں، تو پھر یہ نفع والا دھندہ ہمیں کیوں نہ راس آئے، یہ بات بھی صحیح ہے کہ کلمہ پڑھوا کر چھوڑ دینا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے، مگر سب کچھ سمجھا کر کلمہ نہ پڑھوا سکے تو یہ بہت ہی غلط ہے، اور کلمہ پڑھوائے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ زندگی بھر مدعو پر محنت کرتے رہے، ان کو مطالعہ کراتے رہے، دلائل سے سمجھاتے رہے، کلمہ پڑھوانے کی نوبت ہی نہ آئی، تو اس کا فائدہ کیا ہے۔

خصوصا ہمارے ملک ہندوستان میں جہاں ہمارے برادران وطن اور غیرمسلم بھائی اکثر ہندو ہیں، ان میں سے اکثر رسمی طور پر ہندو ہیں، شعوری طور پر ہندو بالکل نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ہمارے ایک بہت بڑے ہندو مذہب کے قائد اور سند سمجھے جانے والے اسکالر

نے یہ بات بتائی کہ ہمارے ملک میں ہزاروں ہندوؤں میں سے کوئی ایک ویدوں کے درشن کر پاتا ہے، جب کہ یہ ان کی مرکزی کتاب ہے اور لاکھوں میں کوئی ایک اسے پڑھتا یا پاٹھ کرتا ہے اور بتایا کہ پورے ملک کے تقریبا سو کروڑ ہندو بھائیوں میں ایک سو سے زیادہ ویدوں کو سمجھنے والے نہیں، گویا ایک کروڑ ہندو بھائیوں میں ایک کو چھوڑ کر یہاں سب رسمی ہندو ہیں، شعوری ہندو نہیں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں پر دعوت کا کام کرنے کے لیے صلاحیت کی ضرورت نہیں، بلکہ جرأت کی، اور چونکہ یہ قوم اہل محبت قوم ہے، اس لیے محبت کی ضرورت ہے، یہاں بس جرأت اور محبت کے ساتھ ''پڑھ کلمہ'' کہنے والوں کی ضرورت ہے، کتنے لوگوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اپنے مدعو پر لمبی مدت سے محنت کررہے ہیں، مگر بس تعارف اور غلط فہمی دور کرنے تک بات رہتی ہے، کلمہ پڑھنے کو نہیں کہا، جب ان سے پوچھا گیا کلمہ پیش کیا؟ تو کہتے ہیں، ہمت نہیں ہوئی اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ کلمہ پڑھنے کو کہنے کے لیے ہمت ''پڑھ کلمہ'' کہنے ہی سے آتی ہے۔

سہ ماہی تربیتی کیمپ میں شریک علماء سے یہ حقیر عرض کررہا تھا کہ زندگی کے ایک پل کا اطمینان نہیں، کون سا سانس آخری ہو، اور کون سی دل کی دھڑکن آخری ہو، اور موت کے بعد پھر ہمیشہ کی ناکامی یا کامیابی اور دوزخ یا جنت، اگر آخرت میں جنت ودوزخ کا یقین اور ایمان یعنی کلمہ پڑھنے پر نجات کا مدار ہے، اس پر یقین ہے، تو ہمارے لیے دلیلیں دینا اور خوب سمجھانا کہاں ممکن ہے؟ ایک آدمی کنویں یا نہر میں ڈوب رہا ہو، یا آگ کے الاؤ میں گرنے جارہا ہو تو انسان کیا کرے گا؟ یہ بات عقل کے لحاظ سے کہاں درست ہے کہ کنارے پر کراس کے سامنے لمبی تقریر کرنے لگے:
(صفحہ نمبر ۲۴۷ سے ۲۵۷)

سوال: اللہ کا شکر ہے کہ مختلف لوگ دعوت کے کام پر لگ گئے ہیں، ان کام کرنے والوں میں باہمی تعاون اور کام کو مربوط کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: اس حقیر کا خیال ہے کہ لوگوں کو اپنے اپنے دائرہ میں اور اپنے طریقہ سے کام کرنے دینا چاہیے، بس ہر کام کرنے والے کے کام کا اعتراف اور خود اپنی بساط بھر ان کا تعاون اور ان سے استفادہ کرتے رہنا چاہیے، بہت زیادہ اتحاد کی کوشش مفید ہونے کے بجائے مضر ہوسکتی ہے، ہم جیسے کام کرنے والوں میں اخلاص کی کمی تو ہے ہی، ہر ایک یہ چاہے گا لوگ میری اقتدا میں کام کریں، جو ظاہر ہے ممکن نہیں، بس ہم لوگ کام کرتے رہیں اور کم ازکم ہر ایک کے ساتھ تعاون کے ساتھ اپنی راہ پر کام کرتے رہیں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ بس یہی کافی ہے۔

سوال: آپ اکثر یہ فرماتے ہیں کہ دعوت کی راہ میں بڑی رکاوٹ داعی اور مدعو دونوں کا ایک دوسرے پر عدم اعتماد ہے، خصوصا مسلمانوں کی منفی ذہنیت، اس کا کیا علاج ہے؟

جواب: داعی اور مدعو کا رشتہ طبیب اور مریض کا ہوتا ہے، اگر طبیب اپنے مریض کو حریف، مخالف اور سازشی سمجھے گا تو علاج کا سوال ہوہی نہیں ہوسکتا، اصل بات یہ ہے، اور اس کا علاج عملا میدانِ دعوت میں امت کا اترنا ہے، میدان دعوت میں جب آخری درجہ کے اسلام دشمن اور مسلمانوں اور اسلام سے دشمنی رکھنے والے لوگوں کو دعوت دیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ دشمنی کسی عدم واقفیت اور غلط واقفیت پر مبنی تھی، ہمارے ایک دوست نے ''ہمیں ہدایت کیسے ملی'' کے عنوان سے چھ نئے مسلمان ہونے والے لوگوں کے انٹرویوز ''ارمغان'' سے منتخب کرکے ہندی میں چھپوائے ہیں، میرے فون پر ایک صاحب کا ایس ایم ایس آیا ''میں بجرنگ دل، اور وشوہندو پریشد کا اسٹیٹ ذمہ دار ہوں، آپ جب فرمائیں مجھے بات کرنی ہے۔'' میں نے بات کی، کوئی گوسوامی جی بول رہے تھے، بتانے لگے کہ مجھے ایمبولنس میں بھی مسلمان اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر مگر مجھے ہدایت کیسے ملی، پڑھی تو بالکل سوچ بدل گئی، میں نے قرآن مجید بھی پڑھ لیا ہے، اب آگے کے مسائل پر بات کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد

مجھے کس طرح مسائل سے نمٹنا پڑے گا، میدانِ دعوت میں لگ کر **فانھم لایعلمون** کی حقیقت سمجھ میں آئے گی۔ یہ منفی سوچ مثبت اور خیر خواہانہ سوچ میں صرف دعوت سے بدل سکتی ہے، یہی اس کا علاج ہے۔ (صفحہ۲۹ ۷)

سوال: آپ نے ایک مضمون لکھا ہے ''ہر مرض کی دوا ہے ''صلِ علی محمد'' جو کتابی شکل میں شائع ہورہا ہے، آپ نے اس میں پوری دنیا کے مسائل کا حل دعوت میں بتایا ہے، جب ہم لوگوں سے یہ بات کہتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ غلو اور دعوتی فوبیا ہے، جب کہ اسلام، مذہب اعتدال ہے، اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: بلاشبہ اسلام مذہب اعتدال ہے، غلو کسی بھی چیز میں ٹھیک نہیں ہے، مگر ہمارے لیے اعتدال کا معیار طے کیا گیا ہے، ورنہ تو ہر آدمی اپنے طریقے اور فکر کو معتدل بتائے گا، اور سچی بات یہ ہے کہ کوئی غالی ترین آدمی بھی اپنے کو غلو پر نہیں سمجھتا، بلکہ اعتدال پر سمجھتا ہے، اس کے لیے اعتدال کی راہ ہمارے لیے عملی طور پر طے کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی شکل میں۔ جب ہم سیرت نبوی پر غور کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر خیر کے کام میں آپ حد درجہ سبقت لے جانے والے، عبادت میں نماز کا یہ حال ہے کہ ساری ساری رات کھڑے ہیں، پاؤں پر ورم آجاتا ہے، مگر کسی نے آپ کو یہ نہیں کہا کہ آپ اتنی نمازیں کیوں پڑھتے ہیں؟ آپ پر نماز کا جنون طاری ہوگیا ہے۔ آپ روزے رکھتے تھے، مگر اس کے لیے آپ کو مجنون نہیں کہا گیا، آپ کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ آپ کی ملکیت میں مال ہوتا تو بعض مرتبہ جب تک وہ سارا تقسیم نہ ہوجاتا، آپ گھر تشریف نہ لے جاتے، سائلوں کو واپس نہ لوٹاتے، قرض لے کر لوگوں کی ضرورت پوری کرتے، اور قرض خواہ پھر آپ کو تکلیف پہنچاتے، مگر اس کے لیے آپ مجنون نہیں کہا گیا، کسی اور خیر یا بھلائی کے کرنے میں آپ کو مجنون نہیں کہا گیا، قرآن مجید میں نو بار جنون کا لفظ آیا ہے، دوبار دوسرے نبیوں کے لیے اور سات بار ہمارے نبی ﷺ کے لیے، ہر مقام پر اسی دعوتی سوز کہ لوگ کس طرح

ایمان میں آجائیں اس کی فکر میں مجنون کہا گیا، اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسوہ حسنہ کی روشنی میں اعتدال یہ ہے کہ آدمی پر دعوتی جنون طاری ہو، اور دل لوگوں کو کفر وشرک اور دوزخ سے بچانے کے سوز میں تڑپے، لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں دعوتی فوبیا ہوگیا ہے، جنون ہوگیا ہے، ہمیں حیرت ہے کہ ہم دعوت دعوت گلے کے اوپر سے چیخ رہے ہیں، کاش اللہ تعالیٰ دل ودماغ پر رحمتہ للعالمین نبی کریم ﷺ کے جنون تڑپ اور باخ نفس کا کوئی حصہ عطا فرمادیں۔ یہ حقیر خاص مقام اور وقت میں سب سے زیادہ یہی دعا کرتا ہے کہ ہمیں بھی نبی ﷺ کا تڑپنا نصیب ہوجائے، کاش ہمیں دعوتی فوبیا ہوجائے۔ (صفحہ نمبر ۷۳۰)

سوال: داعی کو میدانِ دعوت میں جس چیز کا لحاظ رکھنا زیادہ ضروری ہے، ان میں سب سے زیادہ مفید بات کون سی ہے بتادیں؟

جواب: الگ الگ لوگوں کے الگ الگ جوابات ہو سکتے ہیں، اس حقیر کا تجربہ یہ ہے کہ کارِ دعوت کارِ نبوت ہے، اس عظیم کام کی عظمت کے ساتھ اپنی نااہلی اور کم مائیگی کا جس قدر احساس ہوگا، اللہ تعالیٰ فتوحات کے فیصلے فرماتے ہیں، اپنی ناکارگی، بے عملی، کم علمی اور نااہلی کے احساس سے تضرع اور مناجات کی توفیق بھی زیادہ ہوتی ہے، انسان کے پاس دعا اور سوال کے علاوہ کوئی سہارا ہی نہیں، اور جب حد درجہ تضرع کے ساتھ آدمی دعا کرتا ہے تو مولائے کریم کی طرف سے عطا کے فیصلے ہوجاتے ہیں، اس کے لیے ماہِ مبارک کا مہینہ تو ہے ہی مانگنے کا، ہم لوگوں کا منہ کہاں کہ احکم الحاکمین کے دربار عالی میں حاضری دیں، بس احساس اعتکاف کے بہانے در پر ڈالے رکھتا ہے کہ حاجت پوری اس در کے علاوہ کہیں سے ہو نہیں سکتی، اس لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ (صفحہ نمبر۷۳۳)

حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ

عالمی ختم نبوت تحریک کے قائد اور سلسلہ نقشبندیہ کے ممتاز بزرگ حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب بھی وصال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات خوب بلند فرمائے اور ہمیں ان کا بدل عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت مولانا خان محمدؒ نے ختم نبوت کے محاذ پر غیر معمولی خدمات سرانجام دیں، ملک بھر کے دورے کئے، اندورن اور بیرون ملک کانفرنسیں منعقد کیں اور اس مقصد کے لیئے اپنے حلقۂ مریدین کو متحرک کیا، غرض کہ اس محاذ پر ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، جو ناموس رسالت کے باب کا اہم ورق ہیں۔

مولانا موصوف پاکستان میں نقشبندی سلسلہ کے سب سے بڑے بزرگ شمار ہوتے تھے، ان کی خانقاہ ہر وقت سالکین راہ محبت سے آباد رہتی تھی اور روزانہ ملک بھر سے آنے والے افراد سے بھری رہتی تھی، چالیس پچاس افراد کی یومیہ آمدورفت تو معمول تھی، ان کی خانقاہ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دن رات کے کسی بھی حصہ میں کوئی طالب، سالک یا مہمان آیا تو اس کے قیام وطعام کا انتظام موجود رہتا تھا۔

مولانا موصوف کا خاندان صدیوں سے رشد وہدایت کا ذریعہ بنا رہا، موصوف کی تربیت، خانقاہی ماحول میں ہوئی، ان کی لائبریری میں قدیم اسلامی کتب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، جس سے ہر با ذوق فرد آسانی سے استفادہ کر سکتا تھا۔

حضرت مولانا موصوف کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ ان کے خانقاہ میں سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے ان سارے اسباق کی تکمیل کا اہتمام تھا، جو اس سلسلہ کے بزرگوں نے نفس کی سرکشی کو کچلنے اور حالت فنا سے حالت بقا کے حصول کے لئے مقرر فرمائے تھے، دوسری خانقاہیں تو اس اعتبار سے اب بڑی حد تک نام ہی کی خانقاہیں رہ گئی ہیں۔ لیکن حضرت مولانا نے لوگوں کے تزکیہ نفس، اور سلوک ہی کو مقصود بنا لیا تھا اور موصوف آخر وقت تک اس کام میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ مصروف رہے۔

حضرت مولانا خان محمدؒ کی ایک بڑی خصوصیت جس کی اس وقت سلسلہ کے بزرگوں میں شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ صدیوں سے تصوف واہل تصوف نے خانقاہوں کے وارثوں اور مربیوں اور سالکوں کے لئے جو اصول وضوابط قائم کئے تھے، مولانا نہ صرف یہ کہ ان اصولوں پر پوری سختی سے قائم رہے، بلکہ حقیقی طالبوں کی تربیت میں ان اصولوں کو پیش نظر رکھا تصوف کے ان اصولوں میں کم ملنا، کم بولنا، کم کھانا، کم سونا، جیسے اصول شامل ہیں اور ذکر وفکر میں انہماک اور ان اصولوں پر پابندی کے نتیجہ میں صبر، توکل، زہد، قناعت، سادگی، درویشی، دنیا سے بے نیازی، رضا باالقضا اور رضائے الٰہی کا حصول زندگی کا مشن بن جاتا ہے۔حضرت مولانا کی پوری زندگی اور خانقاہ ان اصولوں اور اس کے نتائج کا مکمل نمونہ بلکہ آئینہ تھی۔

حضرت مولانا موصوف ضرورت سے زائد بولنے کے روادار نہیں تھے، سامعین کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے، ضرورت سے زائد ایک جملہ بھی ادا نہیں فرماتے تھے، اس لئے کہ ان کے سامنے اکابر بزرگوں کا یہ نکتہ پیش نظر تھا کہ جسے ہماری خاموشی اور تفکر سے کچھ نہیں ملتا، اسے ہماری مجلس میں آنے کی ضرورت نہیں، حضرت مولانا خان محمدؒ کی شخصیت کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ انہوں نے دعوتی مقاصد اور اپنے حلقہ کی توسیع کی خاطر سلسلہ کی خلافت کا معیار گرا کر، خاص وعام کو خلافت کا مجاز نہیں بنایا، بلکہ زندگی بھر کی کاوشوں کے نتیجہ میں بمشکل چند افراد ہی کو اس قابل سمجھا کہ وہ یہ بار امانت اٹھا سکیں، عالم ربانی چونکہ نفس کو مطیع کرنے کی جدوجہد میں برسہائے برس تک شب وروز قیامت خیز گھاٹیوں سے گذرتا ہے، پندہ بیس سال تک اسے مسلسل نفس کی نئی نئی سرکشیوں اور مکر وفریب کے نئے نئے حملوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس لئے اپنے نفس کے تجربات کے پیش نظر، عالم ربانی خلافت کے معیار کو گرانے کا کسی طور متحمل نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اس کے بعد خلافت کے نام پر حرص وہوس کی دوڑ اور دولت کے ڈھیر جمع کرنے کی آرزوؤں اور معاشرہ میں ٹکراؤ کو روکنا دشوار ہے۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرہ میں سب سے زیادہ سستی چیز سلسلوں کی خلافت رہ گئی ہے، حضرت مولانا خان محمدؒ نے اس سلسلہ میں بزرگوں کے تسلسل کو جس

طرح قائم رکھا، ان کا یہ کردار دوسرے بزرگوں کے لئے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲)

مولانا خان محمد صاحبؒ کے بارے میں قاضی حسین احمد صاحب نے بھی اپنی یادوں کے حوالے سے کچھ تاثرات بیان کئے ہیں یہاں وہ تاثرات بھی پیش کئے جاتے ہیں جس سے مولانا کی شخصیت کے کچھ اہم پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

عظیم لوگ خاموشی سے قیادت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ میں نے خواجہ خان محمد ربانی کے ساتھ بہت ساری نشستوں میں، کئی کئی گھنٹے گذارے ہیں، وہ ہمیشہ ختم نبوت کی کانفرنسوں میں کرسی صدارت پر رونق افروز ہوتے تھے۔ نہ افتتاحی کلمات کہتے تھے، نہ اختتامی کلمات، اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار اشاروں کنایوں میں کردیتے تھے۔ مولانا اللہ وسایہ ان کے دست راست تھے، وہ ان کی رضا مندی حاصل کر لیتے تھے، وہ اس کے مطابق کانفرنس کی قرار دادیں اور اس کے پروگرام کی تشکیل کردیتے تھے۔

''ایک بار اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل کے ہال میں، ختم نبوت کی مجلس کے زیراہتمام علماء کی ایک مجلس منعقد ہورہی تھی۔ مجلس ختم نبوت کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ اس میں ہر مکتب فکر کے مسلمان شریک ہوا کرتے تھے۔ میری تقریر کے دوران میں، ایک عالم دین کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ تم علماء کی مجلس میں ان پر تنقید کرکے اچھا نہیں کررہے ہو۔ دراصل میں انہیں متوجہ کررہا تھا کہ علماء کی مجالس بوریانشینوں کے شایان شان طریقے پر مساجد یا مدارس کے ھالوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں، جو عوام وخواص کے لئے کھلی رہتی تھیں، اور جن میں اس ملک کے غریبوں اور فقیروں کو داخل ہوتے ہوئے، کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ یہی لوگ دراصل انقلاب اور تبدیلی لانے والے ہوتے ہیں۔ علماء کے خلاف یہ سازش کی گئی ہے کہ انہیں بڑے ہوٹلوں اور بڑی شان وشوکت والے ہالوں میں اپنے جلسے منعقد کرنے کے لئے وسائل فراہم کردیئے جاتے ہیں، تاکہ انہیں اپنے حقیقی دائرہ اثر سے منقطع کردیا جائے، غریب اور فقیر لوگ ان کے اجلاسوں میں شرکت کرتے ہوئے جھجک محسوس کریں اور وہ اپنے تئیں یہ سمجھیں کہ وہ

شاندار ہوٹلوں میں قیام کرکے، دین کی بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور بڑے لوگوں تک ان کی بات پہنچ رہی ہے۔ جس صاحب نے میری تقریر کے دوران کھڑے ہوکر اعتراض کیا، میں نے ان سے عرض کی کہ اگر میری بات انہیں اچھی نہیں لگ رہی تو میں بیٹھ جاؤں اور اپنی بات یہیں ختم کرلوں۔ حضرت خواجہ ربانیؒ نے اپنے معمول کے مطابق کچھ کہے بغیر، ان صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھے اپنی بات جاری رکھنے کا اشارہ فرمایا۔

قادیانیوں کے ربوہ کے قریب مسلمانوں نے ربوہ ہی کے نام سے اپنا ایک مرکز قائم کیا ہے، جس میں مجلس ختم نبوت نے ایک مسجد، مدرسہ اور قیام گاہ تعمیر کر رکھی ہے اور اس میں سالانہ جلسہ ہوتا ہے، جس میں ہر مکتب فکر کے دینی جماعتوں کے قائدین شرکت کرتے ہیں۔ مجھے شرکت کی دعوت دینے کے لئے مجلس ختم نبوت کا ایک وفد حضرت خواجہ خان محمد ربانی کا خط لے کر آیا اور ان کی دعوت پر میں شریک اجتماع ہوا۔ مجھے تقریر کی دعوت دی گئی تو چند افراد نے جلسہ گاہ میں اودھم مچا دیا، یہ افراد اس تنظیم سے تعلق رکھتے تھے، جنہیں کسی بھی حوالے سے مسلمانوں کا اتحاد ایک آنکھ نہیں بھاتا، ظاہر ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے اتحاد کے مخالف ہوں، وہ مسلمانوں کے خیر خواہ تو نہیں ہو سکتے۔ اختلاف پیدا کرنا تو آسان ہے اور اختلاف تو ایک گھر کے مکینوں اور سگے بھائیوں اور بہنوں میں ہوتا ہے اور ایک ہی مسلک اور ایک جماعت میں بھی لوگوں کی آراء میں اختلاف ہوتا ہے اور اس اختلاف کو نظر انداز کرکے ہی لوگ مشترکات پر جمع ہو سکتے ہیں اور ہم نے ہمیشہ مسلمانوں کو ''قدر مشترک'' اور ''درد مشترک'' پر جمع ہونے کی تلقین کی ہے، لیکن افسوس کہ کچھ لوگ 'ترجیحات'' اور ''اولویات'' کا شعور نہیں رکھتے اور ترجیحات کی سمجھ نہ ہونے کی وجہ سے، اختلافات کو بڑا بنا دیتے ہیں اور مشترکات پر اتحاد کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

اودھم مچانے والوں کو سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ خان محمد ربانیؒ نے حسب معمول اپنی ناپسندیدگی کا اظہار خاموش احتجاج کے ذریعے کیا اور کرسی صدارت چھوڑ کر، مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ جلسہ کے منتظمین نے تقریبا (۱۳) افراد کو قابو کرکے، کمرے میں بند کر دیا اور

ہمیں دوبارہ جلسہ منعقد کرنے اور اپنی تقریر جاری رکھنے کے لئے کہا۔ خواجہ ربانیؒ نے پھر اپنی صدارتی نشست سنبھالی اور جلسہ پہلے سے زیادہ صبر وسکون اور انہماک کے ساتھ جاری رہا۔

مدرسۂ شرانوالہ میں میرا پہلا تعارف، آج سے تیس برس پہلے مولانا منظور احمد چنیوٹی مرحوم نے حضرت خواجہ خان محمد ربانی سے کرایا۔ ان دنوں میں جماعت اسلامی پاکستان کا قیم (سیکریٹری جنرل) تھا۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی مرحوم میرے بڑے بھائیوں مولانا عبدالسبوح قاسمیؒ اور مولانا محمد عبدالقدوس قاسمیؒ کے دیوبند کے ہم سبق تھے۔ میرے بڑے بھائیوں کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ ایک طرف تو دیوبند کے ممتاز علماء میں شامل تھے اور مولانا سید حسین احمد مدنی کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور دوسری طرف وہ عصری علوم میں ایک مقام رکھتے تھے، چنانچہ مولانا عبدالقدوس صاحب پشاور یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے شعبے کے صدر اور مولانا عبدالسبوحؒ فاضل دیوبند ہونے کے ساتھ ساتھ، کولمبیا یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی (PHD) تھے، لیکن دارالعلوم دیوبند، اپنے اساتذہ اور دیوبند کے ہم سبق فضلاء کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کو آخری دم تک برقرار رکھا۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی مرحوم بھی اسی حوالے سے بھائیوں کی طرح محبت اور بے تکلفی برتتے تھے، خواجہ خان محمد ربانیؒ سے متعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ حضرت دیکھیں ''کہ نوردیدہ اش روش کندچشم زلیخارا'' ان دنوں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام میں چپقلش تھی، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فارسی کا ایک مشہور شعر پڑھا!

''غنی روزہ سیاہ پیر کنعان را تماشہ کن۔ کہ نوردیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا''

غنی (شاعر کا نام) کنعان کے بزرگ (حضرت یعقوب علیہ السلام) کی سیاہ بختی کا تماشہ دیکھو کہ اس کے آنکھوں کا نور (حضرت یوسف علیہ السلام) زلیخا کی آنکھوں کا نور بنا ہوا ہے۔ میں نے عرض کی کہ یہ آپ کی بدگمانی ہے، میں اس وقت بھی دین کی خدمت میں لگا ہوا ہوں اور تمام علماء حق سے میری عقیدت میں کوئی فرق نہیں آیا اور مسلمانوں کو ''قدر مشترک'' اور ''درد مشترک'' پر جمع کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ حضرت خواجہ خان محمد ربانی نے حسب معمول تبسم فرمایا اور زبان سے انہوں نے

کچھ نہیں کہا۔

''تبسمے بہ لب اور سید وہیچ نہ گفت''

ان کے ہونٹوں پر ایک تبسم پھیل گئی اور انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ ان کی زندگی میں بار بار ارادہ کیا کہ ان سے فیض حاصل کرنے کے لئے خانقاہ سراجیہ میں حاضری دوں، لیکن گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے موقع نہیں ملا۔ **(ماخوذ: بیداری جون ۲۰۱۰ء)**

مولانا حکیم محمد اختؒر

مولانا حکیم محمد اختر صاحب اس پُرفتن دور میں ان چند بزرگوں میں شامل تھے، جن سے اسلاف کی روایات اور یادیں وابستہ ہیں اور جن کی زندگی اسلاف کا نمونہ ہے۔ اللہ نے ان سے اپنی محبت کے پیام کو عام کرنے اور محبت ومعرفت کے ذریعہ اپنے دین کی دعوت کے فروغ کے لئے بہت کام لیا، اس کام کی بدولت انہیں اندرون ملک اور بیرون ملک بہت پذیرائی بھی حاصل ہوئی، لاکھوں افراد ان سے بیعت ہوئے، ان کی صحبت سے مستقل فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد بھی کافی مقدار میں ہے، ان کی خانقاہ میں ان سے وابستہ متوسلین کی تربیت کا پروگرام ہوتا تھا، جہاں باقاعدہ قیام وطعام کا انتظام تھا، اس طرح اس تربیت گاہ میں شریک ہونے والے افراد ایک نئی توانائی اور نئی ایمانی قوت کے ساتھ جاتے تھے، اور اللہ کی محبت میں مستقل رہنے اور اسلامی شریعت پرگامزن ہونے کا عہد لے کر واپس جاتے تھے۔

بزرگوں کے ہاں صدیوں سے اپنی خانقاہوں میں مریدوں کے مستقل قیام اور ان کی روحانی واخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس کا بہتر اور مؤثر نظام رہا ہے، ایک ایک خانقاہ میں بیک وقت دو دوچار چار ہزار مریدوں کے قیام وطعام کا انتظام موجود تھا، اس دور میں خانقاہوں کے ہاں وقف جائداد بھی ہوتی تھی اور مخیّر حضرات خانقاہوں کے ساتھ دل کھول کر تعاون بھی کرتے تھے، لیکن مسلمان ملکوں پر جدید سامراج کے غلبہ کے بعد جہاں نئے دور کے افراد میں بزرگوں کی بزرگی اور روحانی اصلاح کے سلسلہ میں نقطہ نگاہ میں تبدیلی واقع ہوئی، وہاں خانقاہوں کے ساتھ مالی تعاون کا سلسلہ بھی بڑی حد تک منقطع ہوا، اگر مالی تعاون ہوا بھی تو وراثتی گدی نشینوں نے اس تعاون کو ذاتی املاک میں تبدیل کر دیا۔ نیز وراثتی گدہ نشینوں اور حقیقی اہل اللہ کے درمیاں تمیز بھی قائم نہ رہی۔

حالات کے اس پس منظر میں مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل تو یہ ہوا کہ ان کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا دوم یہ کہ انہیں ایسے اصحاب خیر بھی کافی تعدا میں ملے، جو خانقاہ اور اس کی ضروریات کے لئے دامے درمے سخنے ان کے ساتھ دل کھول کر تعاون کرتے تھے، ان کے ہاں چالیس چالیس دن کا تربیتی پروگرام ہوتا تھا، جس میں اندرون ملک اور بیرون ملک مخلص مرید شریک ہوتے تھے۔ غالبا پاکستان بھر میں اس طرح کے چلوں پر مشتمل روحانی تربیتی پروگراموں کی مثال مولانا کی خانقاہ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔

مولانا کے خلفاء کی لسٹ میں بھی دو ڈھائی سو سے افراد شامل ہیں۔ جن میں یقیناً بعض تو وہ خلفاء ہیں، جو نفس کے ساتھ طویل عرصہ کے مجاہدوں کے بعد اس سے معرکہ آرائی میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ لیکن بعض خلفاء ایسے بھی ہیں، جنہیں دعوتی پیغام کو عام کرنے کی خاطر حسن ظن کی بنا پر اجازت دی گئی ہے، نظر آیا ہے کہ چونکہ اس طرح کے افراد سیرت وکردار میں پختگی ہوکے مقام تک پوری طرح نہیں پہنچ سکے اور حب جاہ وحب مال جیسے امراض کا علاج پوری طرح نہ کرسکے ہیں، اس لئے خلافت خود ان کے لئے ایک طرح کی آزمائش بن گئی۔ اس طرح کے متعدد افراد کا مشاہدہ ہوا ہے۔ تاہم چونکہ حضرت مولانا کا خلافت دینے کا مقصد نیک تھا، اس لئے انہیں تو بہرحال اجر ہی ملے گا۔

مولانا کے ہاں نظر بد سے بچنے کی خصوصی تلقین ہوتی تھی۔ اس پر بہت زیادہ زور صرف ہوتا تھا۔ موجود دور میں نظر کا فتنہ ایسا ہے، جس سے بچاؤ کی صورت بہت زیادہ مشکل ہوگئی ہے۔ مولانا کی تلقین کی وجہ سے ان کے مریدوں کی بڑی تعداد نظر کے فتنوں سے بچنے میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب سے راقم الحروف کی متعدد ملاقاتیں ہوئی ہیں اور انہیں قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کی سادگی، اخلاص، بے لوثی

نے بہت متاثر کیا ہے۔ یہ ملاقاتیں ڈاکٹر تقی الدین صاحب کی معرفت ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر تقی الدین صاحب جرمنی کی ایک یونیورسٹی سے کیمیا میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ساتھ ساتھ جامعہ فاروقیہ سے درس نظامی کے فاضل بھی۔ موصوف ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب سے بیعت تھے، ان کے وصال کے بعد وہ مولانا ابرار الحق صاحب سے بیعت ہوئے، جو حضرت محمد اختر صاحب کے بھی مرشد تھے، اس طرح ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب پیر بھائی ہوئے۔ اس دور میں تصوف سے میری نئی وابستگی ہوئی تھی۔ اور مجھے صحیح بزرگ کی تلاش تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوگئیں۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب نے فون پر بتایا کہ مولانا ابرار الحق صاحب کراچی تشریف لائے ہیں۔ میں مولانا کی زیارت کے لئے کراچی آیا اور حضرت حکیم صاحب کی مسجد سے ملحق خانقاہ میں پروگرام ہوا، جس میں شرکت ہوئی۔ بعد ازاں ڈاکٹر تقی الدین صاحب کے ساتھ یہ بھی پروگرام بنا کہ ۱۵ دن کے لئے بھارت جاکر مولانا ابرار الحق صاحب کی صحبت ومعیت اختیار کی جائے۔ ابھی یہ پروگرام بن ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو سعودی عرب سے کسی کمپنی کی طرف سے ملازمت کا آرڈر آ گیا اور ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ لیکن ان کی وساطت سے حکیم سے دوتین ملاقاتیں ہوئی۔

ہماری متعدد کتابوں پر حضرت حکیم صاحب کی طرف سے ہمیں حوصلہ افزائی پر مشتمل خطوط میں ملے، جو ہماری کتاب ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' میں شامل ہیں۔

ہمارے بزرگ دوست ڈاکٹر عرفان الکریم انصاری صاحب، حضرت حکیم صاحب کی طرف سے اجازت یافتہ تھے، وہ بتاتے تھے کہ حکیم صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی معرفت کے اس مقام پر فائز ہے، جہاں وہ خلافت کی مستحق ہے، لیکن چونکہ بزرگوں کے ہاں خواتین کو خلافت دینے کا رواج نہیں ہے، اس لئے اجازت نہیں دیتا۔

ہم نے اپنی کتاب ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' حضرت حکیم صاحب کی شخصیت پر مختصر تعارفی خاکہ لکھا ہے۔ اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے:

''حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب طریقت بزرگ ہیں۔ کئی محاذوں پر دعوت دین کا کام کر رہے ہیں۔ ان کی زیر نگرانی دارالعلوم قائم ہے جہاں سیکڑوں طلبہ مقیم ہیں۔ جو دینی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ دارالاشاعت کا نظام ہے۔ جہاں دینی کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے۔ خانقاہ بھی قائم ہے۔ جہاں بلا مبالغہ ہزاروں افراد اصلاح کے لئے حضرت مولانا سے رجوع ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو زبان و بیان اور تحریر کی ایسی صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ موجودہ مشائخ اور علماء میں اس طرح کی صلاحیت بہت کم شخصیتوں کو حاصل ہے۔ موصوف دعوتی کاموں کے لئے افریقہ، یورپ، بنگلہ دیش اور عالم اسلام کے دوسرے ممالک کا اکثر دورہ کرتے رہتے ہیں۔ کراچی کے علمی ومذہبی حلقوں میں ان کی تقریروں اور ملفوظات کا شہرہ ہے، مختلف اداروں کی طرف سے ان کے وعظ ونصیحت اور ملفوظات پر مشتمل پمفلٹ اور رسائل بھی اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تقاریر اور بیان سن کر اور تحریریں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے قلب میں ایک سوز ہے، جو ساری رکاوٹیں اور حجابات کو توڑ کر سننے والے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں داخل ہورہا ہے۔ الفاظ وبیان میں اس طرح کی تاثیری قوت غیری معمولی ریاضتوں، بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

مولانا حکیم محمد اختر صاحب بیک وقت کئی محاذوں پر دعوت دین اور اشاعت دین کا کام کر رہے۔ تحریر، درسگاہ، خانقاہ، اندرون ملک وبیرون ملک دورے۔ وغیرہ۔ انکی جدوجہد کو دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہمارے معاشرے کو اس طرح کی متحرک اہل دل شخصیتیں وافر مقدار میں حاصل ہوں، تاکہ مسلم امت کی نشاۃ ثانیہ کا عمل تیز ہو سکے۔ لیکن ظاہر ہے ہمارا معاشرہ اس طرح کی شخصیتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے ناقدر شناس قوموں کے لئے قدرت کی طرف سے ایسی شخصیتوں کی آمد روک دی جاتی ہے۔

حضرت مولانا کی تحریر کردہ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ''رسول اللہ ﷺ کی

سنتیں'' ''رسول اللہ ﷺ کی نظر میں دنیا کی حقیقت'' ''معارف مثنوی'' ''معارف شمس تبریز'' ''روح کی بیماریاں اور انکا علاج'' ''معرفت الاہیہ'' ''مجالس ابرار'' ''صدائے غیب'' ''ملفوظات حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری'' ''صحبت اہل اللہ اور اسکے فوائد'' ''ایک منٹ کا مدرسہ'' ''قرآن وحدیث کے انمول خزانے'' ''مواعظ حسنہ۔'' **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' جولائی ۲۰۱۳ء)**

مولانا عبدالکریم قریشیؒ

مولانا عبدالکریم قریشیؒ سندھ کے دیوبند مکتبہ فکر کے اکابر بزرگوں کی آخری نشانی تھے، مولانا تاج محمود امروٹی کے ممتاز خلیفہ مولانا حمادالله **هالیجوی** کے سب سے بڑے خلیفہ مولانا عبدالکریم قریشیؒ ہی تھے، ان کی طرف لوگوں کا ہر وقت رجوع رہتا تھا، روحانی استفادہ کے لئے آنے والے افراد کی کافی بڑی تعداد مستقلاً ان کی صحبت میں رہتی تھی، دنیاوی کام کاج، سفارشی خطوط، دعاؤں وتعویذ وغیرہ کے لئے لوگوں کی اکثر آمد رہتی تھی۔

مولانا موصوف کی سب سے بڑی ادا یہ تھی کہ موصوف اپنے مرشد حضرت مولانا حمادالله هالیجوی کی طرح صبح سے عشاء کی نماز تک لوگوں کو دستیاب ہوتے تھے، مسجد یا مسجد کے ساتھ کھلے میدان، جو درختوں کے سایے تلے تھا، وہاں چار پائی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔

مولانا عبدالکریم قریشیؒ جمیعت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ کے سرپرست تھے، ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں موصوف قومی اسمبلی کے لئے سکھر کی سیٹ سے پیپلز پارٹی کے امیدوار کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تھے، وہ دور ذولفقار علی بھٹو کی مقبولیت کے عروج کا دور تھا، اس کے باوجود سکھر سے انہیں بھاری اکثریت سے ووٹ ملے، فرماتے تھے کہ کچھ پولنگوں پر دھاندھلی ہوئی، جس سے وجہ سے پیپلز پارٹی معمولی ووٹوں سے جیت گئی۔

مولانا مزاجاً سیاست سے طبعی مناسبت نہیں رکھتے تھے، اخبار میں بیان دینے سے دور رہتے تھے، تصویر نکالنے اور اس کی اشاعت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

مولانا موصوف کی بعض ادائیں ایسی تھیں، جو تلاش کے باوجود معاشرہ میں ان

اداؤں کی حامل شخصیتیں اب خال خال ہی نظر آتی ہیں، زہد، سادگی، درویشی، دنیا واہل دنیا سے بے نیازی کے معاملہ میں وہ اپنی مثال آپ تھے، پوری زندگی کچی اینٹوں اور گاڑے کی بنی ہوئی چھت کے مکان میں رہے، چھت سے برسات کا پانی بہنے لگا تو باہر سے اپنے ایک متعلقہ مستری کو بلاکر ان کو چھت پر نیا گاڑہ بنا کر دینے کے لئے کہا، مستری کو ان کے فرزند نے گاڑا دینے سے روک دیا اور کہا کہ اب مکان بوسیدہ ہوگیا ہے، نئے گاڑے سے کام نہیں بنے گا، مولانا کے صاحبزادے اور مستری کے درمیان اس کشمکش میں کام رک گیا، مستری نے حضرت مولانا سے درخواست کی کہ مجھے کچھ دنوں کی چھٹی دی جائے، تاکہ میں گاؤں جاکر اپنے کچھ کام کرکے آؤں، مولانا نے کہا کہ تمہیں اجازت ہے، لیکن آکر چھت کو یہی گاڑا دینا ہوگا۔

مولانا کا قائم کردہ مدرسہ بھی کچی اینٹوں اور گاڑے کی چھت کا بنا ہوا تھا، مولانا اکثر حالات میں اپنے مریدوں سے اعانت کی رقم قبول نہیں کرتے تھے، سخت گرمی کے موقعہ پر متعدد مرید ایئر کنڈیشن خرید کر لائے، تاکہ مولانا کو سہولت ہو، لیکن مولانا نے اسے واپس کردیا، ایک مرید نے کافی بڑی رقم پیش کی، قبول نہیں کی، اپنی جیب سے کچھ رقم نکال کر، اس رقم میں شامل کرکے کہا کہ یہ اپنے غریب عزیزوں کو دیدو، اس دور میں مولانا کی شخصیت میں فقر محمدی کے ایسے اجزاء موجود تھے، جس کا منظر کم ہی نظر آتا ہے۔

مولانا عبدالکریم قریشیؒ کی صحبت میں بڑی تاثیر تھی، جو فرد بھی ایک بار طلب کی نیت سے آیا، وہ گویا مولانا کا اسیر بن گیا اور ان کی زندگی کے رنگ ڈھنگ بدلنا شروع ہوگئے۔

مولانا کے مریدوں میں تعلیمی اداروں کے پروفیسر اور صاحب ثروت لوگ بھی شامل تھے، ان کی بڑی کوشش تھی کہ مولانا کا مکان بہتر بنایا جائے اور یہاں طالبوں کے لئے بہتر خانقاہ تعمیر کی جائے، لیکن مولانا نے ان کی ساری کاوشوں اور اصرار کے

باوجود سادہ زندگی اور سادہ معاشرت کو ترجیح دی، زندگی بھر اسی پر عامل رہے۔

مولانا بڑے عالم دین تھے، ان کے ہاں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن ہوتا تھا، جس میں موصوف نے متعدد بار قرآن کی تفسیر ختم فرمادی، ان کی تفسیرِ قرآن کے کچھ حصے چھپ چکے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں ان کا اہم کام جدید سندھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے، اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لفظی ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ قرآن کی آیت کی معنیٰ بھی پڑھنے والوں کے ذہن نشین ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ جو فرد قرآن کا لفظی ترجمہ سیکھنا چاہتاہے، اس میں لفظی ترجمہ سمجھنے کی استعداد بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

لوگ اپنے معاملات کے فیصلہ کے لئے بھی مولانا کے پاس آتے تھے، ضلع نواب شاہ کے ایک گاؤں کے ایک مولوی صاحب، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے عرض کی کہ ہمارے گاؤں کے وڈیرے صاحب نے میری ایک ایکڑ اراضی پر قبضہ کیا ہوا ہے، میں نے انہیں بڑی منت سماجت کی، لیکن انہوں نے میری زمین واپس نہیں کی، چنانچہ میں نے آئی جی، ڈی آئی جی اور ایس پی کو درخواست بھیجی، اس درخواست پر وڈیرے صاحب سے جواب طلبی ہوئی ہے، اب موصوف مصالحت کے لئے تیار ہیں، کہتے ہیں کہ کسی بزرگ سے فیصلہ کرایا جائے، میں نے ان کے سامنے آپ کا نام پیش کیا تو انہوں نے رضامندی اختیار کرلی، آپ اگر وقت عنایت فرمائیں اور ہمارے یہاں تشریف لائیں تو آپ کا ممنون ہوں گا، مولانا نے انہیں آنے کی تاریخ دیدی، مقررہ تاریخ پر مولانا موصوف وڈیرہ صاحب کی اوطاق پر تشریف لائے، فیصلہ سننے کے لئے گاؤں کے لوگوں کا بڑا مجمع جمع ہوگیا، مولانا نے فرمایا کہ گفتگو شروع ہوجائے، وڈیرہ صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ تم بات شروع کردو، مولوی صاحب نے وڈیرہ صاحب سے کہا آپ ہی گفتگو کی شروعات کریں۔

ایک دوسرے پر اصرار میں پانچ دس منٹ لگ گئے، مولانا نے کہا کہ میں خود ہی

گفتگو شروع کرتا ہوں۔

واضح ہوکہ وڈیرہ موصوف سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اہل تشیعت سے وابستہ تھے، مولانا نے مولوی صاحب کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بڑے دکھ اور اذیت کی بات ہے کہ تم نے ایک ایکڑ زمین کی خاطر سادات کے خلاف پولیس کو درخواست دی اور اتنی معمولی اراضی پر ان کو پریشان کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے ساتھ تم نے یہ حشر کیا ہے، آخرت میں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح منہ دکھا سکوگے۔

مولوی صاحب، مولانا کی اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور مولانا سے کہا کہ یا حضرت، میں اپنی دعویٰ سے دستبردار ہوا، اب یہ زمین سید صاحب کی ہے۔

ادھر جب سید وڈیرہ نے یہ صورتحال دیکھی تو انہوں نے کہا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے مہلت دے دیں، تاکہ میں اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے تنہائی میں مشورہ کرسکوں۔

وہ باہم مشورہ کرکے واپس آئے تو کہا کہ ہم نے زیادتی کی ہے، یہ اراضی مولوی صاحب ہی کی ہے، ہمیں معاف کیا جائے، ہم زمیندار ہیں، ہم سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک ہیں، اس لئے مولوی صاحب کی یہ پیشکش ہمیں قبول نہیں۔

اس طرح مولانا کی حکیمانہ گفتگو کے بعد معاملہ سلجھ گیا، یہی نہیں، بلکہ کچھ دنوں کے بعد یہ ہوا کہ یہ سید صاحب اپنے بھائیوں اور اپنی اولاد کو لیکر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ کے فیصلہ نے ہماری دل کی آنکھیں کھول دیں ہیں، اب ہم سب کو اہل سنت جماعت میں شامل کرلیں اور بیعت بھی کرلیں۔ مولانا عبدالکریم قریشیؒ صاحب کے اس طرح کے حکیمانہ فیصلوں کے کئی واقعات مشہور ہیں۔

اس عاجز کا کئی سال تک معمول رہا کہ سال میں ایک بار لاڑکانہ کے قریب

اپنے گاؤں جانے کے موقعہ پر بیر شریف میں مولانا کی صحبت وزیارت کے لئے ضرور جاتا تھا، ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا سے رخصت طلب کی تو فرمایا، نہیں، ایک دن اور ٹھیرو۔

مولانا کی درویشی، سادگی، مریدوں کے ساتھ ان کی محبت کی ادائیں، آنے والے لوگوں کی گھنٹوں تک الٹی سیدھی باتیں سننے کی ان کی خصوصیت، صاحب کشف ہونے کے باوجود اپنے کشف کو چھپانے کی استعداد، بزرگی کے ممتاز مقام پر فائز ہونے کے باوجود آخری حد تک فنائیت کی ادا، ان کی یہ ساری صفات سلف کا زندہ نمونہ تھیں۔

ہماری سندھی اور اردو زبان میں شایع شدہ کتابیں مسلسل مولانا کی خدمت میں جاتی تھیں، ملاقات کے موقعہ پر تحسین فرماتے تھے، سندھ میں الحاد ودہریت کے نظریاتی چیلنج سے مقابلہ کے سلسلہ میں ہمارے علمی کام کو وقت کی ضرورت قرار دیتے تھے۔

مولانا سمیع الحق

مولانا سمیع الحق صاحب، طبقہ علماء کی وہ ممتاز شخصیت ہیں، جو اسلام اور ملت کے دفاع کے مختلف محاذوں پر عرصہ سے استقامت سے کام کررہی ہے، دارالعلوم اکوڑہ خٹک کے مہتمم ہیں، جو صوبہ پختونخواہ کی سب سے بڑی جامعہ ہے، ان کے دارالعلوم نے افغانستان میں جہاد کے محاذ پر کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔

موصوف کافی طویل عرصہ سے ''الحق'' کے نام سے دارالعلوم اکوڑہ خٹک کی طرف سے ایک بہتر علمی رسالہ نکال رہے ہیں، جو ملک بھر کے مدارس سے نکلنے والے دینی رسالوں میں اس اعتبار سے اہم رسالہ ہے کہ اس میں وقت کے چیلنج کے موضوع پر اہم مضامین شایع ہوتے ہیں، یہ رسالہ ایک حد تک مذہبی ضروریات کے ساتھ ساتھ ملک کو درپیش چیلنج کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کررہا ہے، اور طبقہ علماء کی بہتر ذہن سازی کا کردار ادا کررہا ہے۔

مولانا سمیع الحق صاحب ایک اہم محاذ جو سنبھالے ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ اپنی تقاریر اور اخباری بیانات کے ذریعہ پاکستان اور پاکستان کی ملت اسلامیہ کے سلسلہ میں عالمی استعمار کی پالیسیوں کی بہتر طور پر نشاندہی کرتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں پاکستان کے حکمرانوں کو بیدار کرنے اور انہیں عالمی استعمار کے آلہ کار کی حیثیت سے کردار ادا کرنے سے انکار کی روش پر اکساتے رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں جنرل حمیدگل کے بعد دوسری شخصیت مولانا سمیع الحق صاحب کی ہے، جن کے بیانات سے حالات اور وقت کا رخ معلوم ہوتا

رہتا ہے، اور ملت کی کشتی عالمی استعمار کی طرف سے جس بھنور میں پھنسائی جارہی ہے، اس پر قوم کو انتباہ ہوتا رہتا ہے۔

اسلام اور ملت کے لئے مولانا سمیع الحق صاحب کے کام وکردار کو دیکھ کر انہیں اگر حقیقی مضطرب عالم دین کہا جائے تو صحیح ہوگا، جو ملت کے غم میں تڑپتا رہتا ہے اور اس کے لئے اپنی صلاحیتوں کے مطابق آخری حد تک اپنے کردار کی ادائیگی کے لئے فکرمند رہتا ہے۔

محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب، مولانا سمیع الحق صاحب کے قریبی ساتھیوں میں رہے ہیں، ہم نے موصوف کو درخواست کی کہ وہ ہمیں مولانا سمیع الحق صاحب کے کام کے بارے میں مختصر مضمون لکھ کر دیں، موصوف نے ہماری درخواست پر دوصفحات کا مضمون ارسال کیا ہے، وہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ **(ادارہ)**

حضرت مولانا سمیع الحق ہمارے ملک کے ان سرکردہ علماء کرام میں سے ہیں، جن کی تگ و دو اور خدمات کا دائرہ مسجد و مدرسہ اور خانقاہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ انہوں نے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

وہ دینی علوم کے ایک کامیاب مدرس ہیں، انہوں نے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں عمر کا ایک بڑا حصہ تدریس وتعلیم کی متنوع مصروفیات میں گزارا ہے اور اب بھی بڑھاپے، علالت اور ضعف کے باوجود شیخ الحدیث کے طور پر ہزاروں طلبہ و اساتذہ کو دینی علوم پڑھانے میں ہمہ تن متوجہ ہیں۔

انہوں نے صحافت کا محاذ بھی سنبھالا اور ماہنامہ ''الحق'' اور دیگر جرائد میں اپنی علمی و تحریری صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں علمی و دینی حوالہ سے فکری راہ نمائی کا پرچم جن جرائد نے بلند کر رکھا تھا، ان میں ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، ماہنامہ البلاغ کراچی، ماہنامہ بینات کراچی، ماہنامہ الفرقان لکھنو، ماہنامہ النجم لکھنو، اور

ماہنامہ برہان دہلی عام طور پر میرے مطالعہ میں رہتے تھے۔ اور میری ذہنی و فکری آبیاری میں ماہنامہ ''الحق'' بالخصوص مولانا سمیع الحق کے فکر انگیز اداریوں کا بھی حصہ ہے۔

مولانا سمیع الحق نے ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں علماء کرام، کارکنوں اور خاص طور پر پارلیمنٹ کے ارکان کی راہ نمائی کے لیے جو محنت کی، وہ اس جدوجہد کی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ پاکستان کے دستور کی تدوین وتشکیل کے دوران ۱۹۷۳ء کی دستور ساز اسمبلی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ، اور ان کے رفقاء کے اساسی کردار کے پیچھے مولانا سمیع الحق کی خاموش محنت کی جھلک کا ذکر کیے بغیر دستور میں اسلامی بنیادوں اور دفعات کی شمولیت کے اسباب و عوامل کا تذکرہ مکمل نہیں کیا جا سکتا۔

تحریک نظام مصطفیٰؐ میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی متحرک رفاقت اور قید و بند کی صعوبتیں بھی ان کی زندگی کا قابل ذکر حصہ شمار ہوتی ہیں۔ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کی قیادت میں ''درخواستی گروپ'' کے سیکرٹری جنرل کے طور پر ایک عرصہ تک مولانا سمیع الحق قومی سیاست میں دینی کردار کی مؤثر نمائندگی کرتے رہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی مجلس شوریٰ اور پھر سینیٹ آف پاکستان کے رکن کے طور پر مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کی پارٹنرشپ نے قومی سیاست میں دینی جدوجہد کو ایک نیا رخ دیا۔ دونوں ایوانوں میں اسلامائزیشن کے قوانین و مسودات کی ترتیب وتشکیل اور ان کی منظوری کے لیے ان حضرات کی محنت نفاذ شریعت کی پارلیمانی جدوجہد کا ایک روشن باب ہے۔ اور خاص طور پر ان کے پیش کردہ ''شریعت بل'' نے سینیٹ آف پاکستان اور قومی اسمبلی میں جو ہلچل پیدا کی، اس نے ملک بھر کے سیاسی ماحول کو نئی لہر دی۔ اس دوران پبلک محاذ پر مجھے بھی ان

حضرات کی رفاقت اور کچھ نہ کچھ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جو بحمد اللہ تعالیٰ میری دینی جدوجہد کا باعث افتخار دور ہے۔

افغانستان میں روسی استعمار کی مسلح جارحیت کے بعد افغان مجاہدین کی عظیم جدوجہد کی علمی وفکری سرپرستی اور پشت پناہی میں حضرت مولانا عبد الحقؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ جبکہ دارالعلوم حقانیہ کو اس جہاد کے پشتیبان کی حیثیت حاصل رہی ہے اور دارالعلوم حقانیہ کی جدوجہد کا کوئی شعبہ مولانا سمیع الحق کی بھرپور جدوجہد او رمحنت سے خالی نہیں ہے۔

مولانا سمیع الحق آج بھی دینی تحریکات کی فکری وعلمی رہنمائی اور دینی کارکنوں کی پشتیبانی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور مختلف دینی تحریکات کی تاریخ کے شواہد و دستاویزات کو جمع و ترتیب کے ساتھ تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

میں اسے اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں کہ ان مہمات میں ایک دور تک میں ان کا متحرک معاون رہا ہوں او رآج بھی ایک غیر متحرک کارکن کے طور پر مولانا سمیع الحق کی علمی، دینی اور تحریکی سرگرمیوں میں خود کو ان کا معاون سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائیں اور دینی جدوجہد کی متحرک قیادت کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

پیر ذوالفقار نقشبندی

پیر ذوالفقار نقشبندی کی شخصیت تصوف اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، موصوف نے تصوف کے لئے عالمی سطح پر جو خدمات سرانجام دی ہیں، وہ سب سے زیادہ ہیں اور اس معاملہ میں وہ اس دور کے سارے بزرگوں سے ممتاز ونمایاں ہیں۔ ان کا کام ایسا ہے، جو کئی اداروں کا کام نظر آتا ہے۔ تصانیف کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، جو ان کی طرف سے جاری ہے، مختلف ممالک کے دورے ہیں، جو وہ مسلسل کرتے رہتے ہیں، ہزاروں مرید ہیں، جن کی تربیت کا کام وہ کرتے ہیں۔ سینکڑوں خلیفے ہیں، جن سے وہ رابطے میں رہتے ہیں۔ ایک بڑا دینی مدرسہ ہے، جو انہوں نے جھنگ میں قائم کیا ہے۔ سماجی نوعیت کے بہت سارے کام ہیں، جو وہ اپنے مریدوں اور خلیفوں کے ذریعہ کررہے ہیں۔

پیر صاحب چونکہ جدید تعلیمی ادارہ سے فارغ ہیں، وہ انجنیئر ہیں، اس لئے وہ جدید طبقات میں کام کرنے کے سلیقہ سے پوری طرح آشنا ہیں۔ موصوف نے جدید طبقات کو متاثر کرکے، انہیں راہ سلوک میں لگانے کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے، پیر صاحب جہاں تحریری صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں، وہاں تقریری صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ پیروں میں عام طور پر انتظامی استعداد کم ہی موجود ہوتی ہے، لیکن پیر صاحب اس اعتبار سے خوش نصیب ہیں کہ وہ یہ سارے کام اس طرح سرانجام دے رہے ہیں کہ تقسیم کار کے نتیجہ میں سارے کام ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے قیمتی وقت کے صحیح استعمال کے فن سے پوری طرح آشنا ہیں۔

ان کے خطوط، ملفوظات، تقاریر کے مجموعے اور مختلف موضوعات پر کتابیں دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک کے پیروں میں کوئی ایک شخصیت تو ایسی موجود ہے، جو دور جدید کے رجحانات ومیلانات اور ضروریات کو پیش نظر رکھکر، نئے دور کے چیلنج کے پس منظر میں صحیح خطوط پر کام کررہی ہے۔

موجودہ دور میں جدید نوجوان نسل کو سنبھالنا، ان کی تربیت کرنا اور راہ سلوک میں لاکر انہیں راہ محبت پر گامزن کرنا، یہ پیر صاحب کی امتیازی خصوصیت ہے۔

پیر صاحب نے نہ صرف جدید نوجوان نسل کو متاثر کیا ہے، بلکہ طبقہ علماء میں بھی ایک قابل ذکر طبقہ کو متاثر کیا ہے۔ ملک کے دسیوں شہر ہیں، جہاں ان کے حلقہ اثر کے افراد کے مراقبہ کی نشستیں ہوتی ہیں۔ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی پیر صاحب سے وابستہ افراد باقائدہ ذکر وفکر کے حلقے سجاتے ہیں، پیر صاحب کا جتنا کام پاکستان میں ہے، لگ بھگ اتنا ہی کام دوسرے ممالک میں ہے، جو ہم جیسے افراد کے لئے غیر معمولی مسرت کا باعث ہے۔

موجودہ دور عالمگیر مادیت پرستی کا دور ہے، اس دور میں افراد کے کم سے کم دین وایمان کو بچانا اور ان کی زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تربیت کرنا، یہ کام ایسا ہے جو بڑی سعادت کا کام ہے، خانقاہی نظام سے وابستہ افراد یا دوسری دعوتی شخصیتیں جو بھی یہ کام کررہی ہیں، وہ تبریک وتحسین کی مستحق ہیں۔ اس اعتبار سے پیر ذوالفقار نقشبندی صاحب کا کام ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔

ہماری نظر میں مثالی اہل تصوف میں جو امتیازی خصوصیات موجو د رہی ہیں، ان میں ایک اہم چیز فقر محمدی کے اجزاء ہیں، دنیا سے محبت، دنیا پر فدائیت اور مادی چیزوں پر گرنے کی ادائیں ہر دور میں انسانوں کی خاصیت رہی ہیں۔ فرد وافراد مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، ان پر عام طور پر دنیا کے میلانات ورجحانات غالب رہے ہیں۔ اس دور میں تو افراد سراپا مادیت سے عبارت ہوگئے ہیں۔ اس دور میں اہل تصوف کی بڑی شخصیات میں فقر محمدی کے اجزاء کی کمی ایسی چیز ہے، جو بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

رسالتماب ﷺ کی ساری زندگی اعلیٰ درجہ کی روحانیت کا کامل نمونہ تھی۔ زہد، سادگی، استغنا، بھرپور اجتماعی زندگی کے باوجود دنیا ودولت سے آخری حد تک بے نیازی، گھر میں دو دوماہ تک چولہے کا نہ جلنا، غریبوں اور بے کسوں کی ہر وقت مدد کے لئے تیار ہونا، قرضہ لے کر بھی ان سے معاونت کرنا، کئی کئی دنوں تک فاقہ سے رہنا، حاصل ہونے والے مال کو رات کو سونے سے پہلے ہی اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالنا، ایک رات خلاف معمول گھر میں مال موجود رہا تو اس سے اذیت وتکلیف محسوس کرنا، مدینہ میں حکومت حاصل ہونے اور فتوحات کے باوجود دنیا سے استغنا کے معاملہ میں

اسی روش پر گامزن ہونا۔

رسول اللہ ﷺ کی معاشی ومعاشرتی زندگی کی اس اعلیٰ درجہ کی سادگی اور دنیا سے آخری حد تک بے نیازی کے پس پردہ جو حکمت نظر آتی ہے، غالبا وہ یہی حکمت ہے کہ انسانیت کی سرتاج ہستی کے اس نمونۂ زندگی کو دیکھکر، معاشرہ میں ایک تو آپ کے نام لیواؤں میں فقر محمدی کو فروغ حاصل ہو، افراد، خوشحال زندگی اور دنیا اور سامان دنیا کی دوڑ میں شریک ہونے سے انکار کی روش اختیار کریں۔دوم یہ کہ معاشرہ کے غریب وبے کس افراد آپ کے مثالی فقر سے احساس محرومی سے باہر نکل آئیں اور فقر کی اس زندگی پر انہیں تسکین قلب حاصل ہو۔

قیصر وقصریٰ کی فتحیابی اور دیگر کئی ممالک میں مسلمانوں کے غلبہ کے بعد بالخصوص بنوامیہ کے دور حکومت میں مال کی کثرت ہوئی اور مالداری کے مظاہر عام ہونا شروع ہوئے تو یہ اہل اللہ ہی تھے، جنہوں نے خود اختیار کردہ فقر یعنی (فقر محمدی) کو اختیار کرکے مالدارانہ زندگی کی اہمیت اور وقعت کو کم کیا اور وہ امت میں صدیوں سے فقر محمدی پر عامل رہے ہیں۔

اس طرح انہوں نے اپنی عملی زندگی اور اس کے مظاہر سے معاشی دوڑ میں شریک ہونے اور خوشحال مادی زندگی پر فریفتہ ہونے والوں کے بالمقابل زندگی کا مثالی اسلامی نمونہ قائم کیا ہے۔ اہل اللہ کی یہی خصوصیت ان کا امتیازی شان رہی ہے، ان کی اس طرز زندگی سے مسلم معاشرہ میں صدیوں تک دولت پر مجنون وارانہ طور پر گرنے کی اداؤں میں غیرمعمولی کمی واقع ہوئی۔

اگرچہ بعض اہل اللہ کے ہاں مال موجود رہا، لیکن ایسے اہل اللہ ہزار میں بمشکل ایک دوہی نظر آتے ہیں۔ ان اہل اللہ کی بھی حالت یہ تھی کہ ان کے مال میں غریبوں کا وافر مقدار میں حصہ موجود تھا، اور وہ حب مال اور شان وشوکت والی زندگی سے محفوظ تھے، حضرت بھاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے پاس بہت مال تھا۔ جب ان کا وصال ہوا اور ان کے فرزند حضرت صدر الدینؒ ان کی مسند پر فائز ہوئے تو آپ نے جو پہلا حکم صادر فرمایا، وہ یہ ہے کہ خانقاہ سے سارا مال نکالا جائے اور غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے، آپ کے خلفاء نے جمع ہو کر عرض کیا کہ حضرت، جب آپ کے والد محترم مال رکھ سکتے ہیں تو آپ بھی تو ایسا کر سکتے ہیں۔ حضرت

صدر الدین نے فرمایا کہ والد صاحب کے پاس وہ منتر موجود تھا، جس سے وہ مال کے زہریلے اثرات سے محفوظ تھے، جبکہ میں اس صلاحیت سے قاصر ہوں۔

دوسری چیز جس کی کمی موجودہ بڑی خانقاہوں میں محسوس ہورہی ہے، وہ مجاہدوں کے ذریعہ افراد کی تربیت کرکے، ان سے فنائے نفس کے مراحل طے کرکے انہیں افراد معاشرہ کی تربیت کے کام پر لگانے کی کمی ہے۔

فنائے نفس سے پہلے چونکہ افراد کی اپنی اصلاح خطرہ میں ہوتی ہے، اور وہ نفسی قوتوں کی شدید زد میں رہتے ہیں، اس لئے سلف اور اکابر بزرگوں کے ہاں دس سال کے شب وروز کے مجاہدوں سے پہلے خلافت عطا فرمانے کی روایت موجود نہیں تھی، ہمارے سلسلہ کی بڑی روحانی شخصیت حضرت شاہ غلام علی دھلویؒ نے اپنی ملفوظات کی کتاب میں اس کی تصریح فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ ایک بزرگ نے اپنے بعض مریدوں کو دس سالہ مجاہدوں سے پہلے خلافت دیدی، چونکہ حالت بقا کے مقام تک ان کی رسائی نہیں ہوئی تھی، اس لئے وہ اس وقت پیدا ہونے والے ایک فتنے کی نذر ہوگئے۔

اس دور میں بھی مسلمہ بزرگوں کے ہاں طالبوں سے غیرمعمولی مجاہدے کرائے جاتے رہے ہیں۔ یہاں اس کی صرف دومثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اور ان کے بھائیوں کو ان کے والد صاحب حضرت مفتی محمد شفیع رحمتہ اللہ نے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ سے بیعت کرایا، اور فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب عالم دین نہیں ہیں، ان سے بیعت سے تمہارے اندر اگر علم کا خناس موجود ہوگا تو وہ بھی نکل جائے گا۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے ہماری اصلاح کے لئے دس سال تک ہم پر تقریر کرنے اور مضامین لکھنے پر پابندی لگا دی تھی، ہم نے دس سال تک ان کی ہدایات پر عمل کیا، آخر میں ڈاکٹر صاحب نے ہمیں خطوط کا ایک پلندہ دیا اور فرمایا کہ انہیں پڑھو ، یہ خطوط حضرت مولانا زکریا رحمتہ اللہ نے مکہ سے حضرت ڈاکٹر صاحب کو لکھے تھے اور یہ سارے خطوط ہمارے بارے میں ہی تھے کہ مجھے ان صاحبزادگان کے بارے میں دعویٰ وتکبر کا خطرہ نظر آتا ہے، آپ ان کی اصلاح پر خصوصی توجہ فرمائیں۔''

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ کے ایک مرید کا واقعہ ہے کہ وہ صاحب ۱۵ سال تک ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدے کرتے رہے، ان صاحب کا روزانہ کا ذکر وفکر کا دورانیہ پانچ سات گھنٹے کا تھا۔ وہ صحبت کے لئے بھی روزانہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، پندرہ سال کے مجاہدوں کے بعد اس نے حضرت ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر ایک صاحب حیثیت فرد کو ذکر دیا۔ چونکہ ان صاحب کے مجاہدے بہت زیادہ تھے اور صاحب حیثیت فرد میں طلب بھی موجود تھی، اس لئے ان صاحب کا ذکر جاری ہونا شروع ہوا، اس کے بعد مرید صاحب نے ان صاحب حیثیت فرد سے مفادات وابستہ کرنے شروع کردیئے۔ ڈاکٹر صاحب کو فراست کے ذریعہ مرید صاحب کی اس پوری کارکردگی کا علم ہوا۔ وہ مرید صاحب جب ہفتہ وار حلقہ میں شریک ہونے کے لئے آئے تو ڈاکٹر صاحب نے مجمع کو مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تو کسی صاحب کو دوسروں کو ذکر دینے کی اجازت نہیں دی۔ اس سے مرید صاحب کو انتباہ ہوا۔ اور حضرت ڈاکٹر صاحب کی فراست نے فنائے نفس تک رسائی سے پہلے اپنے مرید کو پیر بن کر نفس پرستی کی راہ اختیار کرنے سے روک دیا۔

اس سے دو باتیں واضح ہوئیں، ایک یہ کہ مادہ پرستی کی موجودہ فضا میں ۱۵ سال تک روزانہ ذکر وفکر کے مجاہدے کرنے اور روزانہ صحبت اہل اللہ کو معمول بنانے کے باوجود عام طور پر نفس کی قوت پوری طرح پامال نہیں ہوتی۔

دوسری بات جو معلوم ہوئی، وہ یہ کہ مجاہدوں کے نتیجہ میں دوسروں کو ذکر دینے سے ان کا بھلا تو ہوسکتا ہے، یعنی ان کا ذکر کا سلسلہ تو جاری ہوسکتا ہے،لیکن مجاہدہ کرنے والے فرد کی اپنی اصلاح خطرہ میں پڑجاتی ہے اور اس کے نفس کی مفادات اور دعویٰ وغیرہ سے بلندی کی صورت بمشکل پیدا ہوتی ہے۔ غیرمعمولی مجاہدوں کے بغیر خلافت عطا فرمانا، دراصل ان شخصیتوں کو ابتلا وآزمائش میں مبتلا کرنا ہے۔

تیسری چیز، جس کی اس دور کے اہل تصوف میں کمی واقع ہوئی ہے، وہ بزرگی کے مقام پر فائز ہونے کے بعد اپنی شخصیت کو مٹاتے رہنے اور پامال کرنے کی کمی ہے۔

اکابر بزرگوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ کی شان عظمت سے کانپتے رہتے تھے، اور شہرت سے لرزاں وترساں رہتے تھے،وہ روحانیت میں جتنا زیادہ

آگے بڑھتے تھے، ان کی عاجزی، انکساری اور نفیٔ ذات میں اسی حساب سے اضافہ ہوتا تھا، اور وہ اپنی تعریف کو اپنے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔

اس سلسلہ میں بھی یہاں اس دور کے دوبزرگوں کے واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک بار مرشدی حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ نے چند افراد کی مجلس میں فرمایا کہ فلاں شعبہ علم میں پاکستان میں مجھے امتیازی حیثیت حاصل ہے (جو ایک اعتبار سے حقیقت بھی تھی) لیکن اس جملہ کی ادائیگی کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب پر عاجزی کی جو کیفیت طاری ہوئی، وہ قابل دید تھی۔ استغفر اللہ کرتے رہے، زبان حال سے فرمایا، زبان سے غلط بات نکل گئی، جو دعویٰ کے ضمن میں شمار ہوتی ہے۔ اللہ مجھے معاف فرمائے۔

دوسرا واقعہ حضرت پیر محمد ابراہیم جان سرھندیؒ کا ہے، حضرت پیر محمد ابراہیم جان سرہندی مجددی سندھ میں حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کی آخری بزرگ شخصیت تھے، اس عاجز نے کوئی ۱۵سال پہلے بیداری ''سندھی'' میں ان کی شخصیت اور خصوصیات پر ایک تفصیلی مضمون لکھا اور جی ایم سید کے الحادی نظریات کے جواب میں ان کی لکھی گئی کتاب پر انہیں خوب داد دی کہ طبقہ علماء میں موصوف پہلی شخصیت ہیں، جس نے جی ایم سید کے فکر کا تعاقب کیا، اس پر موصوف نے اس عاجز کو خط لکھا، جس میں قرآن شریف کے چوتھے پارے کی آیت لکھی " **لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّوْنَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ.**"(وہ افراد جو اپنے (ناپسندیدہ) کاموں پر خوش ہوتے ہیں اور (پسندیدہ کام) جو کرتے نہیں، ان کے لئے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے، ان کے بارے میں یہ خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے بچائے جائیں گے اور انہیں دردناک عذاب ہوگا۔)

لکھا کہ آپ نے میرے بارے میں مضمون لکھکر، مجھے ان خطرات میں مبتلا کر دیا ہے، کہیں میں خود ثنائی کے جرم میں اللہ کی سخت پکڑ میں نہ آجاؤں۔

چوتھی چیز جس کی کمی موجودہ دور کے مشہور بزرگوں میں محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان سے ملنا، اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہونا بہت زیادہ دشوار ہوگیا ہے۔ بالخصوص عام فقراء ان کی صحبت اور قریب سے ان کی زیارت کے لئے ترستے

رہتے ہیں۔ جب کہ سلف میں بزرگوں کی سب سے بڑی مصروفیت ہی طالبوں اور عام لوگوں کو دستیاب ہونا رہا ہے۔ خود اس دور کے بعض بڑے بزرگوں کی حالت یہی رہی ہے، مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ اور ان کے خلیفہ مجاز مولانا عبدالکریم قریشیؒ (سرپرست جمعیۃ علمائے اسلام) صبح کی نماز کے بعد عشا کی نماز تک مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور خواص وعوام سب کو ہر وقت دستیاب رہتے تھے۔

ہمارے مرشد حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ کی بھی یہی حالت تھی کہ کسی نے رات کو ۱۲بجے بھی اگر دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ کھول کر ان سے ملتے تھے۔

حضرت خواجہ خان محمد صاحب کا بھی زندگی بھر کا یہی معمول رہا۔

قرآن میں حضور نبی اکرم ﷺ کو فرمایا جارہا ہے۔ **وصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغوٰۃ والعشی یریدون وجھہ.** (اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا پابند بنائیے، جو صبح وشام اللہ کو پکارتے رہتے ہیں اور اللہ کی رضامندی چاہتے ہیں)۔

اس آیت کی رو سے بزرگان دین نے ہمیشہ اس کام کو اہمیت دی ہے اور طالبوں کی اصلاح وتزکیہ کے سلسلہ میں وہ آسانی سے دستیاب رہے ہیں اور اس کام کو انہوں نے دوسرے سارے کاموں پر فوقیت دی ہے۔

سلف کی یہ امتیازی خصوصیات ایسی ہیں، جو اب مشہور خانقاہوں میں تیزی سے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تصوف واہل تصوف معاشرہ پر اثر انداز ہو کر، اخلاقی وروحانی طور پر اسے تبدیل کرنے اور مادیت کی طوفانی لہروں کو روکنے کے سلسلہ میں بے بس ہیں۔

حضرت پیر ذوالفقار نقشبندی کی شخصیت کے حوالے سے یہ معروضات اس لئے پیش کی گئی ہیں کہ ان کی شخصیت اس دور کے انسان کے لئے رول ماڈل بن سکتی ہے، اگر موصوف سلف کے اس ورثہ سے پوری طرح بہرہ ور ہوں، اس لئے کہ ان کی شخصیت میں بہت ساری خصوصیات وخوبیاں وصلاحیتیں موجود ہیں، جو جدید انسان کو متاثر کرنے کے لئے ہونی چاہئے۔

(۲)

سلف نے تصوف واحسان کے ادارہ کی تشکیل وتدوین کے وقت اس کے جو بنیادی خطوط ونقوش متعین کئے تھے، وہ قرآن وسنت پر غور وفکر کے نتیجہ میں ہی کئے تھے، اس لئے ان خطوط واصولوں کی حیثیت مسلمہ ہے۔

ایک بڑا اصول مالداروں سے تعلقات استوار نہ کرنے اور ان سے دوستانہ مراسم قائم نہ کرنے کا اصول ہے۔ جس پر بزرگان دین تسلسل کے ساتھ قائم رہے ہیں۔ اس لئے کہ مالدار اپنے مال کی طاقت کی بنا پر ایسی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں کہ بڑی سی بڑی روحانی شخصیت بھی ان سے دوستی کے نتیجہ میں ان کے اثرات کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

قرآن میں فرمایا گیا جارہا ہے۔

ولاتمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیوٰۃ الدنیا لنفتنھم فیہ. (سورۃ طہ آیت ۱۳۱)

(آپ ہرگز ان چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھئے۔ جو ہم نے دنیوی زندگی کی رونق سے ان لوگوں کو متمتع کیا ہے، آزمائش کی خاطر)۔

مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ مطلب اوروں کو سنانا ہے کہ جب معصوم کے لئے یہ ممانعت ہے جن میں احتمال بھی نہیں ہے تو غیر معصوم کو تو اس کا احتمال کیونکر ضروری نہ ہوگا۔

دوسری آیت ہے۔

فلا یصدنک عنھا من لایومن بھا واتبع ھواہ فتردیٰ (سورۃ طہ آیت ۱۶)

(جو شخص ایمان نہیں رکھتا اور خواہش کا پیروکار ہے (اس کی صحبت) کہیں تمہیں آخرت سے دور نہ کردے اگر ایسا ہوا تو پھر تم ہلاک ہوگے۔)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں آیت ہے۔ اس آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تفسیر عثمانی میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بُرے کی صحبت سے منع کیا تو اور کوئی کس شمار میں ہے۔

مولانا تھانویؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ منتہی کا مل

سے بھی شرعی تکالیف ساقط نہیں ہوتی اور اس سے اباحت کا ابطال ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث شریف بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ علماء دین کے امین ہیں، اس وقت تک، جب تک وہ مالداروں سے تعلقات استوار نہیں کرتے، جب وہ ایسا کریں گے تو وہ دین کے رہزن بن جائیں گے۔

نفس کا آخر وقت تک محاسبہ کرتے رہنا اور اس کی طرف سے چوکنا، متنبہ اور محتاط ہونے اور اس کی کڑی نگرانی کرتے رہنے کا اصول، جس پر سلف شدت سے گامزن رہے ہیں۔ یہ اصول قرآن کی درج ذیل آیتوں سے واضح ہوتا ہے۔

واذ قال ابراهيم رب اجعل هذا البلد آمنا وجنبنى ان نعبد الاصنام رب انهن اضللن كثيرا من الناس. (سورہ ابراھیم آیت ۳۵-۳۵)

(اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس شہر کو امن کی جگہ بنادے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے بچائے رکھ کہ وہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں، اے پروردگار انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے)۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا تھانویؒ بیان القرآن میں لکھتے ہیں:

اس میں دلالت ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک بے خوف نہیں ہوتے۔ سو ان کا تو کیا ذکر ہے، جو ہر وقت نفس وشیطان کے پھندوں میں پھنسے ہیں تو کسی کو اپنے حال وکمال پر ناز نہ کرنا چاہیے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ دعا کا ادب ہے کہ دوسروں سے پہلے آدمی اپنے لئے دعا کرے، اس قسم کی دعائیں جو انبیاء سے منقول ہیں، اس میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی عصمت بھی خود ان کی پیدا ہوئی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی حفاظت وصیانت سے ہے، اس لئے وہ ہمیشہ اسی طرف التجا کرتے ہیں، جو ان کی عصمت کا ضامن وکفیل ہوا ہے۔

يا داؤد انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس باالحق ولاتتبع الهوىٰ فيضل عن سبيل الله. (سورہ ص آیت ۲۶)

(اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ

فیصلہ کرتے رہنا، اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی)۔

اپنے فضل وکمال کی نفی کرنا اللہ کی شان عظمت کے غلبہ کے تحت اپنے سارے مجاہدوں کو حقیر سمجھکر، ساری توقعات اس کے فضل خاص سے وابستہ کرنا، اپنی ہر ادا سے نفیٔ ذات کا مظاہرہ ہونا، یہ بھی تصوف کے بنیادی اصولوں میں شامل ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن میں ہے۔

ولولا فضل الله عليكم ورحمة مازكىٰ منكم من احد ابدا ولكن الله يزكى من يشاء. (سورہ نور آیت ۲۱)

(اگر تم پر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک وصاف (پاکباز) نہ ہوتا، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے پاک وصاف کر دیتا ہے)۔

مولانا تھانوی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ مدار کار فضل ہے نہ کہ سعی ومجاہدہ۔

تصوف کے اس طرح کے بہت سارے نقوش وخطوط قرآن واحادیث ہی سے ماخوذ ہوئے ہیں، یہ مضمون اس کی مزید تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔

موجودہ دور میں چونکہ تہذیب نفس کے سلسلہ میں سلف کے متعین کردہ خطوط سے بے اعتنائی پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اس کی یاددہانی کی ضرورت تھی۔

کیا دور آ گیا ہے کہ مجھ جیسا عامی فرد، جو اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی اصلاح کی صورت پیدا ہو، اور اس سلسلہ میں اسے متوجہ کیا جائے اور اسے سلف کے نقش قدم پر چلنے کی تاکید کی جائے، وہ خود مشہور خانقاہوں کے صاحبان کے سامنے اس طرح کے نکات بیان کرے، یہ بھی شاید قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

آخر میں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس تحریر کا سب سے زیادہ فائدہ اس عاجز ہی کو رہا ہے، اصلاح کے سلسلہ میں بزرگوں کے صحیح اسلامی خطوط کی بہتر طور پر یاد دہانی ہوئی ہے۔ اور متعدد معاملات میں نفس کو انتباہ ہوا ہے۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت پیر ذوالفقار صاحب کی شخصیت کے حوالے

سے ہونے والی یہ گفتگو اس عاجز کی اپنی اصلاح کے لئے ہی لکھوائی گئی ہے۔

چونکہ میری اپنی اصلاح وياد دہانی کا ذریعہ حضرت پیر صاحب بنے ہیں، اس لئے میں دل کی گہرائیوں سے ان کا ممنوں ہوں اور دعا گو بھی۔ **(ماخوذ: بیداری فروری ۲۰۱۵ء)**

قاضی حسین احمد صاحب

قاضی حسین احمد صاحب، جماعت اسلامی اور عالمی اسلامی تحریک کا قیمتی سرمایہ تھے، وہ سراپاجہد اور تحرک تھے، ان پر ہر وقت اسلام کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی فکر غالب تھی، بلکہ جنوں سوار تھا۔

قاضی صاحب سے راقم الحروف کی بہت ساری ملاقاتیں رہیں۔ ایک دور میں جب میں روزنامہ ''جسارت'' کراچی کا وقائع نگار خاص تھا، اندرون سندھ کے سفر میں بھی ان کا ساتھ رہا۔

ہم نے ۱۹۸۲ء میں ''روسی سامراج عالم اسلام کے لئے چیلنج'' کے نام تین سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کی تقریب رونمانی کے لئے قاضی صاحب کو شرکت کی دعوت دی اور ان سے عرض کیا کہ وہ تحریک جہاد کی اس وقت کی اہم شخصیت پروفیسر عبدالرسول سیاف صاحب سے تقریب میں شرکت کے لئے وقت لے کر دیں، قاضی صاحب نے ان سے بھی وقت لیا، موصوف ان کے ہمراہ حیدرآباد تشریف لائے، یہ تین چار گھنٹے کا پروگرام تھا، جو بست ہال حیدرآباد میں ہوا، جس میں مدیر جسارت محمد صلاح الدین صاحب اور خالد اسحاق ایڈوکیٹ بھی شریک ہوئے۔

ہماری یہ کتاب کافی مقبول ہوئی اردو اور سندھی زبان میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

قاضی حسین احمد عربی، فارسی اور انگریزی زبان کی استعداد رکھتے تھے۔ عالمی اسلامی تحریک کے قائدوں سے ان کے گہرے ذاتی مراسم قائم تھے، وہ اتحاد ملت کے جذبات سے سرشار تھے، مسلم امت کو ایک ہی وحدت کی حالت میں دیکھنے کے شدید آرزومند تھے، اس کے لئے کوشاں بھی تھے، پاکستان میں مختلف دینی جماعتوں اور گروہوں کا مشترکہ اتحادی پلیٹ فارم انہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

موصوف پر اسلام اور ملت کے جذبات اس قدر غالب تھے کہ اس سلسلہ میں

ان کی شخصی انانیت اور شخصی حجابات باقی نہ رہے تھے، وہ ملنے میں اپنائیت کا گہرا تاثر چھوڑتے تھے،اپنے والہانہ دینی جذبات اور اخلاص کی بدولت ہی وہ علمائے کرام کے حلقہ میں بھی کسی حد تک قابل قبول ہونے لگے تھے۔ موصوف نے نوجوانوں کو متحرک کرکے، ان کی قوت کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے کی کافی کوششیں کیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اپنی زندگی اس کام میں صرف کردی۔

افغانستان میں روس کے حملہ سے پہلے ہی موصوف نے کابل یونیورسٹی میں کمیونسٹ فکر کے مقابلہ اور اسلامی فکر کا کام کرنے والے نوجوانوں سے رابطہ رکھکر، انہیں پشتو زبان میں لٹریچر اور دوسری ضروری مدد کا کام شروع کیا تھا، یہ کام انہوں نے مولانا مودودی کی ایما پر کیا تھا۔

افغانستان پر سوویت یونین کے حملہ کے بعد حالات ایسے ہوگئے تھے کہ محسوس ہوتا تھا کہ سوویت یونین کا پاکستان پر قبضہ اب زیادہ دور نہیں، سال دو میں ہی پاکستان، سوویت یونین کا زیرنگیں علاقہ بن جائے گا۔

اس معاملہ میں قاضی صاحب سے صحافی کی حیثیت سے ہماری متعدد بار گفتگو ہوئی اور ہم نے بڑی تشویش کے ساتھ کہا کہ افغانستان تو مفتوح ہوہی گیا، لیکن اب پاکستان کی بھی خیر نہیں، اس پر قاضی صاحب نے ہر بار بڑے حوصلہ سے یہ بات فرمائی کہ بھٹو صاحب، تم دیکھو گے کہ ان شاء اللہ افغانستان ہی سوویت یونین کا قبرستان ہوگا۔ افغانی لوہے چنے ہیں، دشمن کی بڑی سی بڑی طاقت بھی انہیں شکست نہیں دے سکتی۔ اگرچہ راقم الحروف نے اپنی کتاب 'روسی سامراج عالم اسلام کا چیلنج میں' یہی بات تفصیل سے لکھی تھی، لیکن میڈیا میں سوویت یونین کی کامیابی کی جو باتیں چھپتی تھیں، اس سے بعض اوقات یاس تک نوبت پہنچتی تھی، لیکن اس سلسلہ میں قاضی صاحب کا اطمینان اور ان کا حوصلہ جہاں حالات سے ان کی گہری واقفیت کا نتیجہ تھا، وہاں طاقتور ایمان کی بھی علامت تھا کہ وہ کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

قاضی صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے جماعت اسلامی کے کارکنوں میں علمائے کرام سے دوری، اور ان کے کام اور خدمات کو اہمیت نہ دینے اور ان پر تنقید کے رجحان کو غیرمعمولی طور پر کم کیا اور علمائے کرام کے احترام کی کسی حد

تک فضا پیدا کی، چونکہ وہ دیوبند مکتبہ فکر کے خاندان کی شخصیت تھے۔ ان کے ایک بھائی دارالعلوم دیوبند کے فارغ تھے، ان کے والد صاحب مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت تھے، ان کی شخصیت سے محبت کی بنا پر ہی انہوں نے ان کا نام حسین احمد رکھا تھا، اس لئے قاضی صاحب کی نشوونما علمائے کرام کے ماحول میں ہوئی، جس کے اثرات ان کی شخصیت میں موجود رہے۔

موصوف تہجد گذار تھے، تہجد کی عادت نے ان کی شخصیت میں غیرمعمولی اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ ہر ذہین وباصلاحیت فرد اگر تہجد کے ذریعہ اللہ سے رابطہ کے استحکام کی کوشش کرے گا تو اس سے اس کی شخصیت میں خوداعتمادی اور اہل دنیا سے بے خوفی جیسی صفات ضرور پیدا ہوں گی۔

قاضی حسین احمد صاحب نے جماعت اسلامی کی امارت کے دوران جماعت اسلامی کو عوامی بنا کر، اسے بڑی سیاسی قوت دلوانے کی بڑی کاوش کی اور اس کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کر ڈالی۔ لیکن اس میں انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ مذہبی اعتبار سے منقسم ہے، لوگ مختلف گروہی اور مسلکی وابستگیوں کی وجہ سے کسی دینی سیاسی جماعت پر متفق نہیں ہو سکتے، دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمارامعاشرہ اب تک جاگیرداروں کے زبردست اثر میں ہے۔ جاگیرداری دراصل ایک ذہنیت کا نام ہے،یہ ذہنیت روایتی جاگیرداروں سے آگے بڑھکر، عام سیاستدانوں، افسروں اور مالداروں تک میں در آئی ہے۔ اس ذہنیت کا خاصہ یہ ہے کہ ملک کے وسائل اور ملک کی دولت کی گردش کسی بھی طریقہ سے صرف ان تک ہو، اس جاگیردارانہ ذہنیت کی وجہ سے ملک میں صحتمند قیادت کے لئے راہیں دشوار ہیں۔ لیکن ملک میں جماعت اسلامی کی طرف سے طویل عرصہ تک کام کرنے اور منظّم ومتحرک تنظیم اور ہزاروں سے زیادہ فعال کارکنوں کے باوجود کوئی قابل ذکر سیاسی حیثیت حاصل نہ کرنے میں جماعت اسلامی کے اس نصب العینی فکر کو بھی عمل دخل حاصل ہے، جس کے تحت دل کی تبدیلی کی فیصلہ کن اہمیت کی بجائے ذہن کی تبدیلی ہی کو فیصلہ کن اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ کارکنوں میں حقیقی تبدیلی، انقلابی تبدیلی اور مطلوبہ اخلاقی وروحانی قوت پیدا نہیں ہو پاتی اور تبدیلی کی منصوبہ بندی میں دل کی

قوتیں شامل نہیں ہو پاتی۔

پھر چونکہ نظام کی تبدیلی کا کام دین کے بنیادی نصب العینی ہدف کی حیثیت سے غالب ہوتا ہے، اس لئے افراد معاشرہ کی اسلامی خطوط پر تیاری وتربیت کے کام اور اس کے لئے منصوبہ بندی کی فیصلہ کن اہمیت باقی نہیں رہتی، اور یہ جذبہ غالب رہتا ہے کہ معاشرہ تیار ہو یا نہ ہو، تربیت یافتہ افراد موجود ہوں یا نہ ہوں، ریاست میں تبدیلی اور نظام کی تبدیلی کا عمل ہر صورت میں ہونا چاہئے۔

محترم قاضی حسین صاحب کی شخصیت پر ہم نے اپنی کتاب ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' کافی تفصیل سے لکھا ہے، یہ مختصر مضمون اس تفصیل کا متحمل نہیں۔

قاضی صاحب نے اپنی امارت کے دوران اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ وقتی اور ہنگامی اقدامات اور تدابیر کے ذریعہ جماعت اسلامی کو سیاست میں فعال کردار ادا کرنے اور انتخابی سیاست میں کامیابی کے حصول کی صورت پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے ''شباب ملی'' کے نام سے نوجوانوں کو متحرک کیا گیا، خواتین کو جلسوں اور مظاہروں کی راہ پر لایا گیا، اپنی شخصیت کو مصنوعی طور پر عوامی بنانے کی کاوش کی گئی اور اہل وطن کو نئی قیادت کے برسراقتدار آنے کی نویدسنائی گئی، لیکن یہ ساری کاوشیں نہ صرف یہ کہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیں، بلکہ اس سے اسلامی تحرک کا وقار مجروح ہوا، معاشرہ میں جماعت کی جو اخلاقی ساکھ موجود تھی، وہ متاثر ہوئی۔ جماعت کے پرانے کارکن جو جماعت کو دینی واخلاقی حیثیت سے بہتر صورت میں دیکھنے اور جماعت کے اخلاقی معیار کو کم سے کم دینی اخلاقی معیار سے گرنے دینا نہیں چاہتے تھے، وہ بددلی کا شکار ہوئے۔

اصل میں معاشرہ کو دینی اعتبار سے تبدیل کئے بغیر سیاست کے ذریعہ اسلام کو اقتدار پر فائز دیکھنے کی آرزوئیں اور اس کے لئے ہنگامی تدابیر وپروگرام، یہ تجدید احیائے دین کی امت کی تاریخی کاوشوں اور مسلم امت کی گہری نفسیات سے ناواقفیت یا اس سے صرف نظری ہی کا نتیجہ ہے۔ جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مربیوں، مزکیوں اور اولیائے کرام کی صحبت کے مراحل سے گذرے بغیر انسانی

نفس کی خوفناک اداؤں سے آشنائی اور افراد میں موجود حیوانی وجبلی جذبات ومیلانات اور ان کی اصلاح کی راہ میں حائل غیرمعمولی مشکلات اور اس کے لئے معاشرہ میں پتہ ماری سے طویل عرصہ تک کام کئے بغیر کسی بھی اسلامی تحریک کا معاشرہ میں قوت حاصل کرنا اور پیش قدمی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

جماعت اسلامی کے بارے میں صاحبان دل کی آرزو ہے کہ کاش جماعت میں کوئی ایسی شخصیت سامنے آئے، جو اس کے کارکنوں کو پندرہ بیس سال تک اپنی روحانی واخلاقی تربیت، تعلق مع اللہ کے استحکام، اور عبادت کے ذوق وشوق کے ساتھ افراد معاشرہ کو دینی اعتبار سے سنبھالنے کے محاذ پر لگادے، اور پندرہ بیس سال تک سیاست کے محاذ کو سرد کرکے، جماعت کی ساری تنظیمی قوت ووسائل کو اس کام پر لگادے۔ اس کام کے نتیجہ میں ایک تو اسلامی نقطہ نگاہ سے معاشرہ کے استحکام کی صورت پیدا ہوگی دوم یہ کہ معاشرہ، اسلام سے قریب ہوگا تو وہ بہتر سیاسی قیادت کو آگے لانے میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔

اس نکتہ کو سمجھنا ازحد ضروری ہے کہ غلبہ اسلام کا کام جہاں سعادت دارین کا ذریعہ ہے، وہاں غلبہ اسلام کی اللہ کی جو سنت ہے، وہ یہ ہے کہ ایک تو اس کے لئے دینی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے طاقتور اسلامی گروہ موجود ہو، جو اخلاق حسنہ، حمیت دین، ایثار وقربانی، اور اخلاص وتقویٰ جیسے جوہروں سے بہرہ ور ہو دوم یہ کہ معاشرہ کی آبادی کا قابل ذکر حصہ جو کم از کم پچیس تیس فیصد ہو، وہ دل وجان سے اسلام کو چاہتا ہو، اور وہ اسلامی گروہ کی پشت پر کھڑا ہو۔

جب تک ایسا نہیں ہوتا، کوئی اسلامی گروہ برسراقتدار آ کر غلبہ اسلام اور حکومت الٰہیہ کے قیام کا فریضہ سرانجام دے سکے، ممکن نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں نفس پرست اور مخالف اسلام ساری قوتیں (داخلی وخارجی) مل کر اسلامی گروہ کی مزاحمت کرکے، اسے ناکامی سے دوچار کر دیں گی۔ جس طرح عرصہ سے مصر میں ہو رہا ہے۔

(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' فروری ۲۰۱۳ء)

ڈاکٹر طاہر القادری

ڈاکٹر طاہر القادری صاحب ہمارے ملک کی ممتاز علمی شخصیت ہیں، موصوف نے اہم موضوعات پر کئی درجن کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی کتابیں قرآن وسنت اور تصوف کے فہم اور جدیدیت سے آشنائی اور علم واستدلال سے بھرپور ہوتی ہیں۔ بریلوی مکتبہ فکر میں علم واستدلال اور جدیدیت کے فہم کے حوالے سے جو خال موجود تھا، ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے اس خال کو ایک حد تک پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔

موصوف کی دوسری خصوصیت تصوف کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے کچھ تصوف کی ریاضتوں اور کچھ نظر کی مشقوں کی وجہ سے وہ صلاحیت حاصل کرلی ہے کہ اپنے گرد ہزارہا مرد وعورتیں جمع کرنے اور انہیں دین وشریعت کی راہ پر گامزن کرنے کی مؤثر کوشش فرمائی ہے۔

محترم ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے دور جدید کے مفکروں بالخصوص مولانا مودودی کی فکر سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنی فکر کی بنیاد نظام کی تبدیلی اور اسلامی نظام کے غلبہ کی جدوجہد پر رکھی ہے اور اپنی تحریک سے وابستہ افراد کو یہی ہدف دیا ہے۔ موصوف، اپنی تنظیم کے ذریعہ سماجی خدمت کا بھی کافی کام کرتے رہتے ہیں۔ جس کی تفصیل ان کے ماہانہ رسالہ میں اکثر چھپتی رہتی ہے۔ ایسے ہزاروں افراد ہیں، جو دین ومذہب سے دور تھے، محترم ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی کاوشوں سے وہ دین ومذہب کے قریب ہوئے۔

ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی اس طرح کی صلاحیتوں کو دیکھکر، ان سے معاشرہ کی اسلامی بنیادوں پر تبدیلی اور افراد کی مستحکم بنیادوں پر تربیت کی غیرمعمولی

توقعات وابستہ تھیں، لیکن یہ دیکھکر دکھ ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنی بیشتر توانائیوں کو ہنگامی سیاست میں صرف کرکے، اخلاقی وروحانی تربیت کے اپنے کام کو کافی نقصان پہچایا اور سیاست میں جارحانہ انداز وحکمت کے استعمال سے معاشرہ کے دردمند وحساس علمی حلقوں کو مایوس کیا اور اپنی شخصیت کو متنازع بھی بنایا۔

موصوف کے طرز فکر وطرز عمل کا ایک اور کمزور پہلو جس نے انہیں شہرت کی راہ پر گامزن کیا، وہ کشف، القا اور دوسری دنیا کے مشاہدات ہیں، جن کو انہوں نے اپنے تصوف وروحانیت کی بنیاد بنایا، ان کے ان مشاہدات سے متاثر بریلوی مکتبہ فکر کے ہزارہا افراد ان سے وابستہ ہوئے، ان کی وابستگی کے بعد ان کی بہتر اور مؤثر تربیت کی ضرورت تھی، لیکن موصوف نے ان افراد کی قوت کو ہنگامی سیاسی کاموں میں صرف کیا۔

شہرت ومقبولیت ایسی چیز ہے، جس سے اکثر اہل اللہ بھاگتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی کھال بچاتے رہتے ہیں، شہرت کے بارے میں ہی حدیث شریف میں ہے کہ جس شخصیت کی طرف (اس کی شہرت کی وجہ سے) انگلیاں اٹھنے لگیں، وہ ہلاک ہوا، مگر جسے اللہ محفوظ رکھے۔

ہم میں سے بہت سے افراد کی حالت یہ ہے کہ شہرت کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور شہرت حاصل ہونے کے بعد آپے میں نہیں رہتے اور اس شہرت کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر طاہر القادری صاحب اگر اپنے علمی کام کو مستقل مزاجی سے جاری رکھتے، اپنے ساتھ وابستہ افراد کی روحانی واخلاقی تربیت کے لئے ساری توانائیاں صرف کرتے، اور ان کے ذریعہ سے معاشرہ کو اسلامی اعتبار سے مستحکم کرنے کا کام جاری رکھتے تو اس محاذ پر وہ قابل رشک پیش قدمی کر سکتے تھے، اس طرح وہ دوسرے داعیوں کے لئے آئیڈیل بن سکتے تھے۔

لیکن غلبہ اسلام کے نصب العینی فکر اور کشف وکرامات اور مشاہدات کی تشہیر کی وجہ سے حاصل ہونے والی شہرت نے ان کی شخصیت میں موجود توازن کو غیرمعمولی طور پر متاثر کیا، جو دین وملت کے لئے المیہ کی بات ہے۔ جس پر جتنا بھی دکھ واذیت کا اظہار کیا جائے، کم ہے۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس باصلاحیت فرد کو بھی اپنی علمی وعملی کوششوں سے قابل ذکر افراد کی ٹیم مل جاتی ہے، وہ افراد کی اس ٹیم کو اسلامی اعتبار سے معاشرہ کو مستحکم کرنے کے کام کی بجائے انہیں سیاست وانقلاب کے نعروں کی نذر کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر طاھر القادری صاحب ہمہ پہلو شخصیت کے حامل ہیں، وہ دانشور بھی ہیں تو اچھے خطیب بھی، صوفی بھی ہیں تو صاحب تصنیف وتالیف بھی، ایک تحریک کے قائد بھی تو سیاست میں ہنگامی طور پر ہلچل برپا کرنے والی شخصیت بھی، اس لئے ان کی شخصیت پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن ہماری نظر میں ان کی اصل شخصیت صوفی کی ہے۔ اس کی وجہ سے ہی انہیں ہزارہا مرید ملے ہیں۔ جو، ان سے محبت کا معاملہ کرتے ہیں۔ ان کے مرید انہیں اہل اللہ سمجھکر ان سے وابستہ ہیں، اس لئے ہماری نظر میں ان کی شخصیت کے دوسرے سارے پہلو اس پہلو کے مقابلہ میں اہم ہونے کے باوجود بہت زیادہ اہمیت کے حامل نہیں، جس شخصیت کو روحانی فیض رسانی کی مالک ہستی ہونے کی حیثیت سے معاشرہ میں مقام حاصل ہو، اس شخصیت کے لئے زندگی کے معاملات میں متوازن طرزعمل اور بزرگان دین کے شایانِ شان حکمت عملی ہی اس کی زینت ہوتی ہے۔

اگر ایسی شخصیت سیاست کو بھی ہدف بناتی ہے تو اس کی سیاست میں بھی محبت، رواداری اور توازن کا پہلو غالب ہونا چاہئے۔

دوسری صورت میں تصوف وبزرگی کے نام پر معاشرہ میں مقام کرنے والی

شخصیتیں خود تصوف کے لئے متنازع بن جائیں گی، اور سلف کے اس ادارہ کے لئے (جبکہ اس وقت اس کی زیادہ ضرورت ہے) سخت نقصان دہ ثابت ہوں گی۔

یہ سطور محترم ڈاکٹر طاھر القادری صاحب سے حسن ظن کی بنا پر لکھی گئی ہیں، امید ہے کہ موصوف ہماری اس تنقید پر بُرا محسوس نہ کریں گے۔ اگر ہماری اس تحریر میں ان کی دل آزاری کا پہلو موجود ہو تو اس کے لئے ہم ان سے دل کی گہرائیوں سے معافی چاہیں گے۔

مولانا خواجہ عبدالحیؒ

آج سے چار پانچ سال پہلے مولانا احسان الحق صاحب (جن سے کافی عرصہ سے دوستانہ مراسم ہیں) نے بتایا کہ حضرت پیر عبدالحی صاحب، ضلع مانسرہ کے ایک گاؤں گیروال میں رہتے ہیں۔ عمر رسیدہ بزرگ ہیں، پرانے بزرگوں کی نشانی ہیں۔

مولانا موصوف کی اس اطلاع پر دل میں غیرمعمولی طور پر داعیہ پیدا ہوا کہ حضرت خواجہ عبدالحی صاحب کی زیارت کی جائے اور دوچار دن ان کی صحبت میں رہ کر، دل کی زندگی وصحت کی صورت پیدا کی جائے اور حلاوت ایمانی حاصل کی جائے۔ چنانچہ کراچی سے راولپنڈی جانے کی تیاری ہوئی، عبدالکریم گاندھی صاحب (جو اس عاجز سے غیرمعمولی محبت کا تعلق رکھتے ہیں اور اس عاجز پر ان کی نوازشوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے) ان سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی حضرت مولانا عبدالحیؒ کی زیارت وصحبت کی خواہش ظاہر کی اور سفر میں ساتھ چلنے کا شوق دکھایا، اس طرح ہم ۲۰مارچ ۲۰۱۲ء کو راولپنڈی پہنچے، مولانا احسان الحق صاحب کے ذریعہ حضرت خواجہ عبدالحی صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع ہوچکی تھی، ان دنوں مولانا اپنے فرزند کے ہاں اسلام آباد تشریف لائے تھے۔ ہم مولانا احسان الحق صاحب کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مدعا بیان کی کہ دل نے چاہا اور آپ کی صحبت کے لئے حاضر ہوئے، فرمایا، آئے نہیں ہو، بلکہ لائے گئے ہو۔

مولانا کی سادگی، وضع داری، محبت، اور خوش اخلاقی نے پہلی ہی نظر میں متاثر کیا، دودھائی گھنٹے تک گھر کی بیٹھک میں نشست ہوئی، مولانا اپنی ایمان افروز وروح افروز باتوں سے ہمارے دلوں کو گرماتے رہے۔

اس عاجز نے سوال کیا کہ اللہ نے قیمتی زندگی دی تھی، وہ تو بس یوں ہی ضایع ہوئی، آخرت کی کوئی تیاری نہ ہوسکی، کیا ہم جیسے سیاہ کاروں کی نجات وبخشش کی بھی کوئی

صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ ابھی میرا سوال ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ ان کے پوتے بسکٹ وغیرہ کی پلیٹ لائے۔

فرمایا کہ یہ میرے پوتے ہیں، اور حافظ قرآن ہیں اور ان سے فرمایا کہ ان کو تلاوت قرآن سناؤ۔

انہوں نے اچھی قرائت سے قرآن کی آیتیں پڑھی۔ ابتدائی آیت یہ تھی۔

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعا.

(میرے ان بندوں سے کہدو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بیشک اللہ سارے گناہوں کو معاف کرے گا۔)

ان آیتوں سے کچھ تسلی ہوئی۔ اس کے بعد مولانا کے دوسرے پوتے اندر سے چائے لے کر آئے، مولانا نے ان کا بھی تعارف کرایا کہ یہ بھی حافظ قرآن ہیں، یہ بھی آپ کو قرائت کے ساتھ قرآن سنائیں گے۔

انہوں نے جن آیتوں کی تلاوت کی، ان میں ایک آیت یہ بھی تھی **ان الذین قالوا ربنا الله ثم ستقاموا تتنزل علیھم الملائکة الا تخافوا ولاتحزنوا وابشرو بالجنة.**

(جنہوں نے کہا، اللہ ہمارا رب ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔ جو ان سے کہیں گے کہ نہ ڈرو نہ غم زدہ ہوتمہیں جنت کی بشارت ہو)۔

ان آیات کو سننے سے مزید حوصلہ ہوا۔

مولانا موصوف، راولپنڈی سے واہ کینٹ مولانا احسان الحق صاحب کی خانقاہ میں تشریف لائے۔ وہاں موصوف نے دودن مزید ہمارے ساتھ قیام فرمایا اور اپنی گفتگو اور اپنی حرارت قلبی سے ہمیں سرشار کرتے رہے۔ اس دوراں مولانا کی کئی ادائیں ایسی محسوس ہوئی، جنہوں نے ہمیں غیرمعمولی طور پر متاثر کیا۔ ایک یہ کہ ۸۰ سال سے زائد عمر ہونے اور رعشہ کی کیفیت طاری ہونے کے باوجود تہجد کے وقت سے لے کر عشاء کے بعد دیر تک مجلس میں موجود رہے اور اشعار، واقعات اور زبان قال وزبان حال سے اللہ سے عشق ومحبت اور شریعت پر مستحکم رہ کر زندگی گذارنے کی تلقین کرتے رہے۔ مولانا کے ساتھ تین دن کی صحبت کے اس دورانیہ میں عبدالکریم صاحب اور میں

تو کافی تھک چکے تھے، لیکن مولانا پر تھکاوٹ کے آثار نظر نہیں آئے۔

اس دوران عبدالکریم گاندھی صاحب اور اس عاجز نے مولانا کے ہاتھ پر تجدید بیعت بھی کی، جو ہمارے لئے سعادت کی بات تھی۔ رخصت ہوتے وقت مولانا نے اس عاجز کو اپنے سلسلہ کی اجازت بھی مرحمت فرمائی اور عبدالکریم گاندھی صاحب کو تاکید فرمائی کہ وہ زندگی بھر اس عاجز کے ساتھ دوستانہ ومحبانہ تعلق کو قائم رکھیں اور اسے ہرگز نہ چھوڑ دیں۔

کراچی واپسی پر میں نے اپنے سفر کی پوری روئداد حضرت نثار احمد خاں فتحی صاحب کو بتائی، موصوف (جو خود اہل اللہ تھے اور عمر رسیدہ بھی تھے، لیکن اہل اللہ کی زیارت کے مشتاق تھے۔) وہ اپنے خلیفہ حضرت حاجی محمد انیس صاحب اور محترم عبدالرزاق صاحب کو لے کر راولپنڈی واہ کینٹ ان کی صحبت وزیارت کے لئے گئے۔

مولانا احسان الحق صاحب کے ہاں سالانہ روحانی پروگرام میں واہ کینٹ میں ہر بار حضرت مولانا سے ملاقاتیں رہیں اور ان کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ ملا۔ اس عاجز سے خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے رہے، جس پر شرمساری بھی ہوتی رہی، سالانہ پروگرام میں سب سے زیادہ طویل تقریر ڈھائی سے تین گھنٹے تک کی حضرت مولانا ہی کی ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ تقریر کے آغاز میں فرماتے تھے کہ میں عمر رسیدہ ہوں، کئی بیماریوں کا مریض ہوں، شاید مجھ سے زیادہ گفتگو نہ ہوسکے، لیکن اچانک ان میں ایسی توانائی آجاتی تھی کہ سننے والے خود حیرت زدہ ہوجاتے تھے۔ تقریر میں موضوع کے تسلسل کو قائم رکھنے کی ان کی استعداد بھی غیر معمولی تھی۔ تقریر میں بات سے بات نکلتی تھی، لیکن بعد میں وہ اصل موضوع کی طرف آکر تقریر کے تسلسل کو پوری طرح قائم رکھتے تھے۔ تقریر سادہ، قرآن واحادیث اور بزرگوں کے اشعار اور اہل اللہ کے واقعات سے مزین ہوتی تھی، اس میں مزاحیہ رنگ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس لئے ان کی طویل تقریر میں گرانی بالکل بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

مولانا کی ایک بڑی ادا یہ تھی کہ ان کی پوری زندگی **قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین.** کا منظر تھی، آخری سالوں میں ہر وقت اصلاح کے لئے آنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ ہر وقت دستیاب رہتے تھے۔ اور آنے والوں سے گھلے ملے

رہتے تھے، بڑی بات یہ کہ موبائل پر بھی وہ ہر وقت ہر ایک کو دستیاب ہوتے تھے۔ ان میں کوئی امتیازی ادا موجود نہیں تھی۔ مریدوں کی کافی بڑی تعداد تھی، لیکن نہ بنگلہ، نہ کار، نہ خادم، نہ جائداد واملاک، بلکہ بعض اوقات یہ حالت تھی کہ مہمانوں کے لئے دکان سے ادھار سودا لیا جاتا تھا۔

ایک بار تقریر میں یہ نکتہ بیان بھی فرمایا کہ درویش، دولت وسامان دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جہاں بنگلہ اور بڑی گاڑی آگئی، وہاں فیض رخصت ہونے لگتا ہے۔

مولانا کا علم وادب سے بہت گہرا رشتہ قائم تھا۔ فارسی، اردو اور پشتو زبان کے سینکڑوں اشعار انہیں یاد تھے۔ موقعہ ومناسبت سے بیان فرماتے تھے۔

اپنی خانقاہ کی لائبریری کے لئے ہمارے ادارہ کی ساری کتابیں منگوائی تھی، حضرت نثار احمد خاں صاحب سے بھی کتابیں لی گئی تھی۔

''بزرگان دین کی تعلیمات'' کے نام سے ہم نے جو کتاب مرتب کی ہے، جس میں بعض ممتاز بزرگوں کے ملفوظات کی تلخیص کی گئی ہے، اس کے بارے میں متعدد بار فرمایا کہ وہ میرے سرہانے پر رکھی رہتی ہے، روزانہ اسے دیکھتا رہتا ہوں، بیداری مستقلا زیر مطالعہ رہتا تھا، بلکہ اپنے فرزند سے اس کے مضامین پڑھوا کر سنتے تھے۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ کی ایک بڑی ادا جو موجودہ دور کے بزرگوں کے لئے قابل تقلید ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے بیٹے عالم اور صاحب روحانیت تھے۔ لیکن انہوں نے باقاعدہ کسی بیٹے کو بھی خلافت نہیں دی اور اپنا جانشین نہیں بنایا۔ آخری دور میں جب کسی اہل علم نے بیٹوں میں سے کسی کو جانشین بنانے کے لئے عرض کی تو فرمایا کہ جہاں میٹھے پانی کا چشمہ یا کنواں ہوتا ہے ، وہاں پرندے ازخود جمع ہوجاتے ہیں، کھارے پانی کے چشمہ یا کنویں پر کون آئے گا۔

حضرت مولانا نے اپنی اولاد کی تربیت بھی اس انداز سے کی تھی کہ ان کے وصال کے بعد ان کی اولاد میں باہمی الفت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، ان کے چاروں فرزندوں کو دوسروں کی تربیت کی اجازت حاصل تھی، ان کے چاروں صاحبزادے اپنے اپنے مقامات میں شریعت وطریقت کی ترویج کے لئے کام میں

مصروف ہیں۔

کچھ وقت پہلے مولانا اپنے بعض عزیزوں سے عمرہ پر جانے کے لئے کراچی تشریف لائے (عمرہ کا یہ اہتمام مولانا کے نواسے (جو مشہور نعت خواں ہیں، جن کی کسی کاروبار میں بھی شرکت ہے)۔ نے کیا تھا اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت نثار احمد خاں صاحب نے ان کے لئے کھانے کا اہتمام کیا۔ طے ہوا کہ کھانا مولانا کی قیام گاہ پر کھایا جائے گا۔ چنانچہ چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ حضرت نثار احمد صاحب نے مجھے اور عبدالکریم صاحب کو بھی دعوت دی۔ اس موقعہ پر حضرت نثار احمد صاحب کے عقیدتمندوں محترم عبدالرزاق صاحب اور ناصر صاحب نے کافی تحائف پیش کئے، آپ نے قبول تو فرمائے۔ لیکن آدھی سے زیادہ چیزیں آپ نے کھانے میں شریک ساتھیوں میں تقسیم فرما دی۔

اس موقعہ پر حضرت نثار احمد خاں صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کے ساتھ حاجی حبیب الرحمٰن حبیب صاحب کا بھی عمرہ پر جانے کا سنا تھا، وہ تشریف نہیں لائے۔ فرمایا کہ انہوں نے عمرہ کے لئے پیسے جمع کئے تھے، لیکن کوئی سخت ضرورت درپیش آئی، پیسے خرچ ہوگئے (واضح ہو کہ حاجی حبیب الرحمٰن صاحب آپ کے داماد تھے اور خود صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کے بھی کافی مرید تھے۔ پیر ہونے کے باوجود وسائل سے تہی دامنی کی یہ حالت تھی۔)

مولانا کے ہاں سالکین راہ محبت کی ذہن سازی پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ذہن سازی کے سلسلہ میں اتنا اہتمام بہت کم بزرگوں کے ہاں دیکھا گیا ہے، اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے تاکہ باطنی حجابات اور نورانیت کے روپ میں پیدا ہونے والے حجابات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے اور سالکین، اصلاح نفس اور نفس مطمئنہ کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دے کر شریعت ہی کو مقصود سمجھیں اور کشف، کرامات اور دوسری دنیا کے مشاہدات جیسے کاموں کو ہدف بنا کر اصل کام سے رہ نہ جائیں۔ اس سلسلہ میں مولانا سے وابستہ ایک شخصیت کے بارے میں جب مولانا کو معلوم ہوا کہ وہ خود بھی اور اپنے مریدوں کو بھی ارواح سے ملاقات ورابط کے کام کو ہدف کی حیثیت دے کر، اسی کام میں مصروف ہیں تو مولانا کو شدید اذیت ہوئی، اس شخصیت نے اس

موضوع پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دوسری دنیا کے مشاہدات، تصوف میں نہ تو مقاصد میں شامل ہیں، نہ ہی اس کے لوازمات میں سے، یہ تو مجاہدوں کے ذیلی اثرات ہوتے ہیں۔ انہیں فیصلہ کن اہمیت دینا اور ہدف قرار دے کر اس میں مصروف ہونا اور اپنے وابستگاں کو بھی اس میں لگانا، یہ اصل راہ کھوٹی کرنے کے مترادف ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ جو اس سلسلہ کے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں کشف والہام اور ارواح سے ملاقاتوں کو جَو کے بدلہ میں بھی خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایک تو اس سے تصوف کے اصل ہدف اور مقصود کے بدل جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ دوم یہ کہ اس سے بزرگی کی دعویٰ اور شہرت کی راہ پر گامزن ہونے کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے اور مریدوں میں اضافہ اور لوگوں کے رجوع ہونے کی آرزوئیں طاقتور ہونے لگتی ہیں۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ نے انہی خطرات کی وجہ سے کشف والہام کو سرے سے اہمیت ہی نہ دی، بلکہ اس سلسلہ میں جب بھی کسی طالب نے تفصیل سے اپنے حالات بتائے تو زبان قال وزبان حال سے فرمایا کہ اصل چیز ذکر اور عبادت میں استقامت ودوام ہے، ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو اہمیت نہ دی جائے۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عمر رسیدگی اور سخت ضعف کے باوجود خطوط کے جوابات دیتے تھے۔

اس عاجز نے اپنے نفسی حالات کے سلسلہ میں متعدد خطوط لکھے، آپ نے اس کے تفصیلی جوابات دیئے اور لکھا کہ معذوری کی وجہ سے خود لکھنے سے قاصر ہوں، جواب لکھوا رہا ہوں، اسی طرح حضرت نثار احمد صاحب نے اپنے معاملہ میں خط لکھا تو ان کو بھی تفصیلی جواب دیا۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب کی سب سے بڑی ادا، جو ان کی زندگی بھر کی خاصیت رہی، وہ یہ کہ انہوں نے لوگوں کی تربیت اور دعوت واصلاح کے کام ہی کو زندگی کا ہدف بنایا تھا۔ اور اپنی ساری توانائیاں اور سارا وقت اسی کام میں صرف کردیا تھا، بلکہ صحیح الفاظ میں انہوں نے اس کام کے لئے زندگی وقف کردی تھی۔

یہ بہت بڑی سعادت تھی، جو اللہ نے انہیں عطا فرمائی تھی۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب کی یہی وہ ادائیں تھی، جس نے اس عاجز کو غیرمعمولی طور پر متاثر کیا اور حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ کے وصال کی بعد ان کی طرف رجوع ہونے اور ان سے روحانی تعلق قائم رکھنے پر آمادہ کیا۔

اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ قیامت تک اہل اللہ کو قائم رکھیں گے، تاکہ لوگوں کی اصلاح کی صورت پیدا ہوتی رہے، لیکن عملی طور پر یہ نظر آرہا ہے کہ جن اعلیٰ خوبیوں کی حامل روحانی شخصیت رخصت ہوجاتی ہے، ان کی جگہ پُر کرنے کے لئے ان جیسی کیا ان کی آدھی صلاحیتوں کی حامل شخصیت بھی سامنے نظر نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے اور ہمیں مولانا عبدالحیؒ جیسی صاحب روحانیت وصاحب علم وصاحب فہم شخصیت عطا فرمائے۔ **(ماخوذ: بیداری جنوری ۲۰۱۶ء)**

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

ان کی شخصیت کے کچھ پوشیدہ پہلو

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی ادبی، تحقیقی اور ہمہ جہت شخصیت پر اخبارات میں کافی مضامین شایع ہوچکے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اپنے علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے اتنی متعارف ہے، کہ ان کے تعارف کے لئے نام ہی کافی ہے۔

میں یہاں پر اپنی یادوں کے حوالے سے موصوف کی شخصیت کے متعلق کچھ تاثرات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ سندھی میں میری نئی کتابیں ''پرین جی پچار'' اور ''جدید سندھ جا مسئلا اور ان کا حل'' کی اشاعت کے بعد ہوئی تھی۔ یہ دونوں کتابیں سندھ کی دوسری علمی اور ادبی شخصیات کے ساتھ ڈاکٹر بلوچ کی خدمت میں بھی ارسال کی گئیں تھیں۔ تقریبا ۱۹۸۳ء کا دور تھا۔ اس کے بعد تو ہماری کتابیں مسلسل شایع ہوتی رہیں۔ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ایک کتاب شایع کرکے، سندھ کے علمی حلقوں کی طرف ارسال کی جاتی رہی، اس طرح ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ساتھ تعلقات میں اس حد تک مزید استحکام پیدا ہوتا رہا، کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے اس کام کو اپنا کام سمجھ کر، قدر کرتے تھے۔

اس دوران ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بے شمار ملاقاتیں ہوتی رہیں، ہر ملاقات میں یہ محسوس ہوتا رہا کہ سندھ میں موجودہ نظریاتی کشمکش کے اس ماحول میں ڈاکٹر صاحب ، ہمارے اشاعت کے اس کام پر خوشی محسوس کر رہے ہیں، اور دل کی گہرایوں کے ساتھ زبانِ حال سے یہ فرما رہے ہیں کہ سندھی زبان میں جو کام پاکستان کے قیام کے بعد فورا شروع کیا جانا چاہیے تھا، وہ دیر مدار کے ساتھ بہرحال شروع تو ہوا، اور سندھ میں ترقی پسندی اور لادینی فکر کے خلاف بند باندھنے کے لئے ، نظریاتی لٹریچر بہترین حکمت عملی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے۔

ماہنامہ ''بیداری'' جو الحمدللہ ۱۹ سال سے مسلسل ہر ماہ شایع ہوکر پہلی تاریخ کو ہی قارئین کو اعزازی طور پر موصول ہوجاتا ہے۔ ''بیداری'' رسالے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے دلی تعلق کی یہ حالت تھی کہ سال کے اختتام پر فون کرکے فرماتے تھے کہ کسی فرد کو بھیج کر اپنی امانت وصول کرلیں۔ یہ امانت ''بیداری'' کے لئے ایک ہزار روپے تعاون کی صورت میں ہوتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بیداری موصول ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا فون آتا اور کہتے کہ فلاں فلاں مضمون کے مطالعے سے میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے اور آپ کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو جو اعلیٰ محقق، اعلیٰ ادیب اور ممتاز دانشور کی حیثیت سے پوشیدہ رہا، مگر میری نظر میں ڈاکٹر صاحب کے اس پہلو کی بڑی اہمیت ہے، وہ یہ ہے کہ موصوف دردمند مسلمان تھے، اسلامی حمیت کے صاحب تھے، سندھ میں اسلام، اسلامیت اور اسلامی فکر اور اسلامی شعائر کو درپیش خطرات اور نوجوانوں کا کمیونزم کی طرف رجحان اور اپنی تہذیب سے دوری اور سیکولر فکر کے بڑھتے ہوئے رجحان پر وہ غیرمعمولی طور پر فکرمند رہتے تھے۔

میری جب بھی ملاقات ہوتی، وہ اپنی اس پریشانی اور دردمندی کا اظہار کرتے رہتے۔ آخری ملاقات میں محمد امین مگسی صاحب بھی ساتھ تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی دینی حمیت کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے، مگر میرے لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ تشویش نئی نہیں تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیس پچیس سالوں کی ملاقاتوں میں ہمارا موضوعِ بحث یہی چیز رہتی تھی۔ فرماتے تھے کہ محمد موسیٰ بھٹو صاحب، سندھ میں محمد ابراہیم جویو کی سربراہی میں سیکولرزم اور لادینیت کی جو تحریک برپا ہوئی ہے، اس نے ہماری نسلوں کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ ہم نبی کریم ﷺ کے امتی ہیں، اور یہ سیکولر دانشور ہماری نسلوں کو مارکس کے فکر کی طرف موڑ کر مادہ پرست فلاسفروں کے ساتھ تعلق جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس فکر کا ہدف لوگوں کو اللہ، رسول ، دینِ اسلام اور شریعت سے باغی بنانا ہے۔ محمد ابراہیم جویو مارکسٹ ہے۔ اس نے جدیدیت کا مطالعہ کرکے، نوجوانوں کے ساتھ ان کی ذہنی اور علمی سطح پر مباحث کرکے، ان کو فکر دے کر، ذہین افراد کو ہمارے بزرگوں اور ہماری تہذیب سے دور کردیا ہے۔ (محمد ابراہیم جویو

صاحب جس نے سندھ میں سیکولرزم کا بیج بویا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیکولرزم کا مطلب انسان، کائنات اور تخلیق کائنات اور زندگی کے مسائل کے متعلق عقل کے ذریعے غور و فکر کرکے حل نکالنا ہے۔ یہ سیکولرزم اور عقلیت خود خدا کی حیثیت رکھتی ہے۔ واضح ہو کہ جویو صاحب نے میرے تفصیلی مضمون کے جواب میں جو کتاب تحریر کی ہے، اس میں موصوف نے سیکولرزم کی یہی تشریح کی ہے)۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ جدید سندھی نسل کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے، اور یہ سندھ کا بڑا المیہ ہے۔ ہمارا مذہبی اور دیندار طبقہ اپنی سادگی کی دنیا میں رہتا ہے، مولوی صاحبان کو اپنے مسائل سے ہی فرصت نہیں ہے، کہ وہ اس فکر کے زہر کو سمجھ کر علمی طور پر اس کا رد کریں اور لوگوں کو تیار کریں، یہ بہت مشکل ہے۔ آپ نے اس کام کو ہاتھ میں لیکر، اب تک جو کتابیں شایع کی ہیں، اگر کچھ مذہبی لوگ ان کتابوں سے استفادہ کرکے، اپنے حلقہ احباب کو اس فکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے تیار کریں ،تو یہ بڑی خدمت ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ محمد موسیٰ بھٹو صاحب آپ نے اسلامی فکر کے فروغ، اسلام پر کی گئی تنقید کا جواب دینے، فکری مغالطّوں کو دور کرنے ،اور جدید سائنسی انداز سے اسلامی فکر کی تشریح کرنے جیسے کام کا انتخاب کرکے اپنے لئے کام کا صحیح دائرۂ کار متعین کیا ہے۔ آپ کو اس دائرہ کار سے باہر نکل کر دوسرے کام ہاتھ میں نہیں لینے چاہئیں۔ مگر یہ فکر بھی دامن گیر رہنی چاہیے کہ اس طرح کے دو چار فرد بھی تیار کیے جائیں، جو اس فکر کو تحریک کی شکل دیں۔ جس طرح محمد ابراہیم جویو صاحب نے سندھی ادبی سنگت منظّم کرکے، ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ قائم کیا ہے۔ اس طرح کی کاوش کرنی چاہیے ورنہ معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی تشویش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کچھ وقت پہلے ڈاکٹر صاحب ہمارے دفتر تشریف لائے تھے، ایک گھنٹہ اس موضوع پر بحث کرنے کے بعد، لفافے میں کچھ رقم دیتے ہوئے کہنے لگے کہ میری طرف سے معمولی ہدیہ قبول کرلیں۔ یہ کافی بڑی رقم تھی، جس سے ہم نے سندھ میں سوا سو سال سے علمی، ادبی، فکری، نظریاتی اور تحریکی شخصیتوں کے کردار، فکر اور حکمت عملی

کے تجزیے پر مشتمل دو کتابیں ''جدید سندھ کے عالم اور دانشور'' اور پرین جی پچار'' شایع کئے۔

میں نے ڈاک کے ذریعے ادارے کی رسید بھیجی، جس پر فون کرکے کہا کہ بھٹو صاحب، آپ نے رسید بھیج کر ناانصافی کی ہے، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ جو خدمت سرانجام دے رہے ہیں، وہ اس سے بڑی ہے، میں نے یہ ہدیہ آپ کو ذاتی طور پر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ایسا ہے کہ جو **الحب للہ والبغض للہ** کی ترجمانی کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ میں نے سندھ کے لوک ادب، لطیفیات، سندھی زبان اور تاریخ کے موضوع پر جتنا بھی کام کیا ہے، اس کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما رہا ہے، کہ اسلام کا نام لیے بغیر سندھی ادب، اور اپنے بزرگ شاعروں کے حوالے سے جدید سندھی نسلوں کا رشتہ اسلامی تہذیب کے ساتھ جوڑ کر، انہیں یہ نکتہ ذہین نشین کروایا جائے کہ ہمارا تہذیبی تعلق مادہ پرست دانشوروں کے مادہ پرست فکر کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، بلکہ اپنی تاریخ اور تہذیب کے عظیم دانشوروں اور بزرگ شاعروں کے فکر کے ساتھ قائم ہے۔ موصوف کا یہ بھی کہنا تھا کہ میں نے سندھی ادب، سندھی زبان اور تاریخ کے حوالے سے ایسا بنیادی کام کیا ہے، جو ترقی پسندی اور سیکولرزم کے اس طوفانی دور کے گذر جانے کے بعد علم و ادب کے ساتھ وابستہ افراد انشاء اللہ اپنے تہذیبی تسلسل سے وابستہ رہنے میں مددگار ثابت ہوگا، بلکہ وہ اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سندھ میں نظریاتی کشمکش کے سارے عرصے میں ظاہری طور پر جو حکمت عملی اختیار کی، وہ غیر جانبدارانہ حکمت عملی تھی۔ سید سردار علی شاہ کے دور (۱۹۶۰ء) سے لیکر اپنی وفات تک موصوف نے بظاہر اپنے آپ کو اس کشمکش سے دور رکھا۔ اسلامی فکر کے ساتھ وابستہ ادیبوں کے ساتھ ملاقات کرنے میں اور ان کی کتابوں پر اداریہ لکھنے سے بھی وہ معذرت کرتے رہے۔ جس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ اتنے بڑے ادبی اور تحقیقی کام کو متنازع بناکر، اپنے آپ کو مخالف پارٹی کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ اسی حکمت عملی کی بنا پر قوم پرست پارٹی کے

لوگ اپنے علمی اور ادبی جلسوں میں موصوف کو ممتاز محقق اور دانشور کی حیثیت سے مدعو کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ چونکہ میری حیثیت محققانہ، مؤرخانہ اور تعلیمی ماہر کی غیر جانبدارانہ حیثیت کی وجہ سے سندھ کے ہر مکتبہ فکر کے ساتھ وابستہ علمی، تعلیمی، سرکاری و غیرہ سرکاری افراد رجوع کرتے ہیں، اور اسی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے موصوف نے اپنی بے شمار کتابیں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے شایع کروائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اسی حکمت عملی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان سے خالص دینی حلقے ناراض بھی رہے۔ مگر موصوف ساری زندگی اسی لائین پر چلتے رہے۔ ہمارے نزدیک موصوف کی یہ لائین کافی حد تک صحیح تھی۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مداہنت سے کام لے رہے ہیں۔ جس مجلس میں اسلام کا نام لیا جانا چاہئے تھا اور اسلامی حوالے سے بات کرنی چاہئے تھی، وہاں پر بھی موصوف عام اخلاقی نکات بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتے رہے۔

ہم نے سندھی بیداری میں علامہ آئی آئی قاضی کی تقاریر کا سلسلہ شروع کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو پسند کیا، اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ طے یہ ہوا کہ ہم علامہ کی تقاریر کو اردو میں ترجمہ کرکے، اپنے ادارے کی طرف سے شایع کریں، جس کے اخراجات علامہ آئی آئی قاضی یادگار سوسائٹی برداشت کرے گی، جس کا سربراہ موصوف خود تھے۔ اس سلسلے میں سندھی میں بھی تین کتابیں شایع کی گئیں۔ جو سندھ نیشنل اکیڈمی کی طرف سے شایع کی گئیں۔

اردو میں ''مشاہدہ حق'' ''آئینہ حق'' اور ''عرفانِ حق'' کے نام سے کتابیں شایع کی گئیں۔ یہ کتابیں ہمارے ادارے کی طرف سے ملک بھر کے علمی حلقوں میں اعزازی طور پر تقسیم کی گئیں۔ ان کتابوں کے لئے طے ہوا کہ میں اردو ان طبقے کو علامہ آئی آئی قاضی کی فکر کے تجزیاتی مطالعے سے بھی واقف کروں۔ اس سلسلے میں مجھے کتابوں کے ۱۵، ۱۵ صفحات کے تفصیلی اداریے بھی لکھنے پڑے، جو کہ ڈاکٹر صاحب کو پڑھ کر سنائے گئے۔ ڈاکٹر صاحب صاحب کا کہنا تھا کہ آپ نے علامہ اقبال اور علامہ آئی آئی قاضی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو بھی ممتاز فلاسفروں کی لسٹ میں

شامل کیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اس لسٹ میں سے ڈاکٹر موصوف کا نام نکال دیں۔ جس پر ڈاکٹر صاحب سے اس موضوع پر کافی بحث ہوئی۔ میرا موقف تھا کہ جہاں تک میں نے ان تین فلاسفروں کو پڑھا ہے ،نثر میں فلسفیانہ طور پر اسلام کی خدمت جو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے کی ہے،''قرآن اور علم جدید'' 'حکمت اقبال'' تعلیم کے ابتدائی بنیادی اصول'' ''آئیڈیالوجی آف دی فیچر'' اور ''اسلامی منشور'' جیسی کتابیں تحریر کرکے، جس کی مثال اسلامی دنیا میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے علامہ اقبال کی فکر کو جہاں پر اس نے چھوڑا تھا، وہاں سے اس کو آگے بڑھایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، میری زبان سے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تعریف سن کر کہنے لگے ڈاکٹر موصوف کے ساتھ تو میری کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں، ان کی اتنی بڑی فلسفیانہ مہارت کا مجھے کبھی ادراک نہیں ہوا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی تھی کہ موصوف وقت کے صحیح استعمال کے فن سے واقف تھے، وقت کو ضایع کرنے کے وہ قائل نہ تھے۔ ملاقات کے لئے پیشگی وقت لینا پڑتا تھا۔ جب کوئی کام کے اوقات میں، ٹائم لیے بغیر آجاتا تھا تو موصوف احسن طریقے سے خیر و عافیت معلوم کرکے اپنی اداؤں سے یہ تاثر دیتے کہ اس وقت میں مصروف ہوں، برائے مہربانی میرا وقت ضایع نہ کیا جائے، اور میرے اوپر رحم کیا جائے۔ موصوف سیر و تفریح کے لئے بھی وقت نکالتے تھے، شام کو آدھا گھنٹہ تفریح کے لئے نکل جاتے تھے۔ وقت کے اس بہترین اور صحیح استعمال کی بدولت ہی وہ مختصر زندگی میں اداروں جتنا کام سرانجام دے گئے۔

ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع تعلیم اور تعلیمی نظام کے بنیادی اصول، سندھ کا لوک ادب، سندھ کی تاریخ، سندھی صوفیاء کا کلام اور اس پر تحقیق، سندھی زبان کی جاگرتا، اور اس کی ارتقائی تاریخ اور سندھی لوگوں کی صدیوں سے جاری ثقافتی روایات تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ اور اس سے متعلق علوم پر بھی گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ جس کا اندازہ کافی ملاقاتوں میں ہونے والی گفتگو سے ہوتا رہا، مگر ایک دفعہ پروفیسر عبدالخالق سہریانی کے ساتھ ان کے گھر پر ملاقات کے لئے جانا ہوا، میں نے بتایا کہ پروفیسر عبدالخالق سہریانی صاحب نے علاقائی حقوق کے متعلق اسلامی موقف پر

کتاب لکھی ہے، جو آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر صاحب کی کتاب کے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح سیر حاصل گفتگو کی کہ حیرت ہوتی رہی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے کئی سوالات بھی اٹھائے، جس کا جواب پروفیسر صاحب نہ دے سکے۔ دوسری دفعہ عبدالکریم سمیجو کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے گھر جانا ہوا، عبدالکریم سمیجو تعلیم کے حوالے سے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اسی سلسلے میں وہ ڈاکٹر صاحب سے موضوع لینا چاہتے تھے کہ کس موضوع پر تحقیق کی جائے اور اس موضوع کا عنوان کیا ہو۔ چونکہ عبدالکریم سمیجو کی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، اور باقاعدہ تعارف بھی نہ تھا، اس لئے وہ مجھے ساتھ لیکر گئے، غالبا ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے فون کرکے ٹائم لے لیا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی، تعلیم پر تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے کئی پہلو پیش کئے اوراتنے سارے عنوانات بتائے کہ حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کا ذہن کتنا زرخیز ہے۔

البتہ اسلامی فکر، دورِ جدید میں اس کی تشکیل اور جدید مغربی فکر کی ارتقائی صورت کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا ذاتی مطالعہ کافی کم تھا، اس سلسلے میں اتنی معلومات تھی کہ جتنا علامہ آئی آئی قاضی سے سنا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب پر سندھ کی تاریخ اور سندھی ادب وغیرہ پر تحقیق کا ذوق غالب تھا، اس لئے اسلامی فکر اور جدید فکر کے مطالعے کے لئے موصوف وقت نہ نکال سکے۔ کسی بھی بڑے محقق اور ادیب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر موضوع پر یکساں دسترس حاصل کر سکے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کا سندھ کے اکابر صوفی شاعروں کے کلام پر کیا گیا تحقیقی کام ایسا ہے، جس سے ایک عرصے تک استفادہ حاصل کیا جائے گا، خاص طور پر حضرت لطف اللہ قادری، حضرت قاضی قادن اور شاہ عبداللطیف بھٹائی پر کیا گیا کام تو ڈاکٹر موصوف کی تحقیق کا نادر نمونہ ہے۔ اس تحقیق سے ان بزرگوں کی شاعری ایک نئے اسلوب کے ساتھ نمایاں ہوکر سامنے آئی ہے۔ علمی، ادبی اور تحقیقی ذوق کے حامل افراد کے لئے یہ کام تسلی بخش ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان شاعروں کے کلام کا

جدید زبان میں عام فہم ترجمہ بھی ہونا چاہیے، تاکہ پرانی سندھی زبان سے ناواقف افراد ان کی شاعری کو سمجھ سکیں، کہ ہمارے یہ شاعر حضرات جن کو سندھ میں اتنی بڑی عزت اور شان حاصل ہے، وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیونکہ پرانی سندھی زبان ان کے لئے اجنبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

کام کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان شاعروں کی شاعری میں موجود پیغام اور روح کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ چونکہ ان صوفی شاعروں کے پاس عوام اور جدید طبقے کے افراد کے لئے ایک مؤثر پیغام موجود ہے، یہ پیغام روح کو جلا بخشنے، بے چین دل کو سکون فراہم کرنے اور نفس میں غوطہ زن ہوکر حقیقت تک رسائی حاصل کرنے، نفس شناسی اور خدا کی معرفت، دل اور روح کی نفسی قوتوں پر غلبہ حاصل کرکے، انسانی جوہر سے سیراب ہونے کا پیغام ہے۔ ان کے کلام میں موجود ہر شعر نفس شناسی اور معرفتِ رب کے سفر کی کسی نہ کسی حالت پر بحث کرتا ہے۔ اس لئے اکابر بزرگ سندھی شاعروں کے کلام کی معنوی، روحانی اور حقیقی تشریح وتفہیم پر بڑی محنت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مولانا رومی کے کلام کی تشریح کے لئے اردو زبان میں ۲۲، جلد تحریر کئے گئے ہیں، اسی طرح قاضی قادن، لطف اللہ قادری، مخدوم محمد زمان لنواری والے اور شاہ لطیف کے کلام کی تشریح پر اسی قسم کے کام کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک قدم بڑھانے سے ہی ڈاکٹر بلوچ صاحب کے چھوڑے ہوئے کام کی کسی حد تک تکمیل کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

شیخ ایاز کا اسلام کی طرف راغب ہونا اور اس سلسلے میں بیداری میں شایع ہونے والے مضامین پر ڈاکٹر صاحب نے کئی ملاقاتوں میں حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ کیا واقعی شیخ ایاز میں تبدیلی آئی ہے، اور اس نے خدا شناسی کی راہ اختیار کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا کہنا تھا کہ دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، مگر آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو شیخ ایاز کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کی تفصیلات بتائیں اور یقین دلایا کہ شیخ ایاز اب وہ پہلے والا شیخ ایاز نہیں رہا۔

آخری ملاقات جو کہ تین چار ماہ پہلے ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہوئی، جس میں محمد امین مگسی صاحب بھی ساتھ تھے، ایک دفعہ پھر شیخ ایاز کے متعلق معلوم کیا، میں

نے کہا کہ اسلامی عقائد پر یقین اور ذکر وفکر کی حد تک تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شیخ ایاز اسلامی دائرے میں شامل ہو چکے ہیں، اور ان کا اپنے ملحدانہ خیالات سے تعلق باقی نہیں رہا، پرانے ترقی پسند دوستوں میں سے محمد ابراہیم جویو صاحب، جو ان کے رشتہ دار بھی ہیں ان کے سوا باقی تمام ترقی پسند ادیب دوستوں کے ساتھ تعلق ختم ہو چکا تھا۔ مگر ان کے دینی فرائض اور واجبات کی پابندی کے سلسلے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کی دعاؤں اور ہماری طرف سے شایع کردہ کتاب میں دیے گئے ان کے خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف میں کافی حد تک تبدیلی آ چکی تھی۔ البتہ یہ دیکھ کر مجھے اذیت ہوئی کہ موصوف نے اپنی ماضی کی زندگی کے عاشقانہ قصے اور آزادانہ جنسی عمل کا اظہار اپنی آپ بیتی کے ایک جلد میں شایع کردیے ہیں۔ جو کہ نہیں کرنا چاہیے تھا، اپنے گناہوں کو چھپانے کے بجائے اسے ظاہر کرنا یہ دوسروں کو بھی گناہ پر اکسانے کے برابر ہے۔ بندے کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

''بیداری'' سندھی میں مراقبے کے موضوع پر مضامین کی اشاعت اور میری طرف سے مراقبہ پر زور دینے پر ڈاکٹر صاحب نے دو چار دفعہ اس کا ذکر کیا کہ میری ساری زندگی تحقیقی کام میں گذرنے کی وجہ سے مراقبہ کے موضوع پر غور وفکر کرنے پر عملی طور پر مراقبہ کرنے کی توفیق حاصل نہیں ہو رہی، آپ سے دل کی بات کہہ رہا ہوں کہ دل تو چاہتا ہے کہ مراقبہ کروں، اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں کہ کس طرح مراقبہ کیا جائے اس کا طریقہ کیا ہونا چاہیے اور مراقبہ میں تصور کیا کیا جائے؟ میں نے ان کے اصرار پر مراقبہ کا طریقہ تو بتادیا اور کہا کہ ایک تو بزرگان کے کلام کو جمع کرنے اور اس کے معانی بیان کرنے اور اس میں ادبی رنگ بھرنے اور اس کام میں ساری زندگی صرف کرنے کی برکت سے آپ کے دل میں عشق اور محبت کے بنیادی اجزا کسی حد تک داخل ہو چکے ہیں، اس لئے مراقبہ کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ آخری عمر میں ذہن کو مراقبہ کی طرف لانا نہایت مشکل کام ہے۔ جس کے لئے اس راہ کے ماہر کی صحبت اور توجہات کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ آپ کے لئے علمی کام کو چھوڑ کر، اس راہ کے ماہر کے پیچھے چلنا بہت مشکل ہے۔

میرے اس طرح کہنے پر ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد کبھی بھی اس

موضوع پر دوبارہ گفتگو نہیں کی۔

ڈاکٹر صاحب کے متعلق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ موصوف سندھ کی نظریاتی کشمکش کے ماحول میں اپنے کام کو متاثر ہونے سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھنے والی لائین پر کاربند رہے، اس سلسلے میں وہ خاص طور پر اسلامی نظریات کے حامل افراد کا ساتھ دینے سے قاصر رہے، جس کا متعدد بار تجربہ رہا۔ ۱۵ سال پہلے ہم نے ''تحفۃ الہند'' کتاب کا سندھی ترجمہ شایع کرنے کا ارادہ کیا۔ کتاب کے مترجم عبدالہادی تھیبو صاحب نے خواہش کا اظہار کیا کہ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر کتاب کا اداریہ یا تو ڈاکٹر صاحب سے لکھوایا جائے یا پھر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب سے۔

میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ ہندو ازم اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کے تناظر میں ڈیڑھ سو سال پہلے لکھی گئی یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ جس کو پڑھ کر اب تک ہزاروں ہندو مسلمان ہوئے ہیں، مولانا عبیداللہ سندھی بھی اس کتاب کو پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ سندھی زبان میں پہلی دفعہ کتاب کا نہایت عام فہم ترجمہ کرکے، اس کو شایع کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب پر آپ کی طرف سے چند حروف اداریہ کی ضرورت ہے۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے معذرت کی میں نے مزید زور دینے کی بجائے معذرت قبول کی۔

اسی طرح کی درخواست مولانا قاسمی صاحب کو بھی کی گئی، مولانا نے بھی معذرت کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مدظلہ سے اداریہ تحریر کرواکر کتاب میں شامل کیا گیا۔

اس سلسلے میں دوسرا تجربہ ''انسان، کائنات اور قانون فطرت'' کتاب کی طباعت کے سلسلے میں ہوا۔ ہم دوستوں نے فیصلہ کیا کہ انسان، کائنات اور قانون فطرت کے متعلق جدید سائنسی اور طبعی تحقیقات کی روشنی میں ایسا مواد جمع کیا جائے، جس کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ نسلوں کو ان کی ذہنی اور علمی سطح کے حوالے سے توحید، وحدانیت اور اسلامی صداقت کا قائل کیا جائے اور ان کے غور وفکر کے لئے مواد پیش کیا جائے۔ اس موضوع پر تقریبا سوصفحات کی ایک کتاب مذکورہ نام سے ایک ہزار کی تعداد میں شایع کی جائے۔

کتاب کو عام سندھی نوجوانوں تک پہنچانے اور کتاب کے متعلق ان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے طے ہوا کہ کتاب میں نہ تو سندھ نیشنل اکیڈمی کا نام ہو، اور نہ ہی میرا ذکر ہو۔ اداریے کے طور پر ڈاکٹر صاحب سے کچھ مواد تحریر کروایا جائے۔ جس سے پڑھنے والے کو یہ پیغام جائے گا کہ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی طرف سے شایع کی گئی ہے۔ کتاب میں صرف پوسٹ باکس کا ایڈریس شایع کیا جائے گا۔ سندھ کے خاص حالات کے پیش نظر اس حکمت عملی کو اختیار کیا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، کتاب کا مواد بھی سامنے رکھا۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ آپ کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کی کتاب کو کسی کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی طرف سے کتاب شایع کردیں مگر میرے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا مسودہ مجھ سے لے لیا۔ چند دنوں بعد ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے یہی موقف دہرایا، میں نے عرض کیا کہ یہ ایسی کتاب ہے، جس میں اسلامی دعوت کو جدید حوالوں کے ساتھ سائنٹیفک تحقیق کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ کا نام آنے سے اسلامی نقطہ نگاہ سے بڑا فائدہ ہوگا اور انشاء اللہ آپ کی غیر جانبدار علمی اور تحقیقی شخصیت کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اصرار کو دیکھتے ہوئے، اپنے نام کی منظوری دے دی۔ کتاب میں ڈاکٹر کی طرف سے اداریہ کے طور پر کچھ جملے تحریر کیے گئے اور پھر وہ کتاب بڑی تعداد میں چھپواکر تقسیم کی گئی۔ یہ غالبًا ۱۹۸۶ء کے دور کی بات ہے۔

اس قسم کا تجربہ چند سال پہلے اہل علم وقلم کانفرنس کی طرف سے منعقد کردہ کانفرنس کے موقعہ پر ہوا۔ یہ کانفرنس پروفیسر عبدالخالق سہریانی صاحب نے حیدرآباد پریس کلب میں رکھی تھی۔ کانفرنس میں صدارت کی حیثیت سے نام ڈاکٹر صاحب کا دیا گیا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے شرکت سے انکار کردیا۔ قلندر لکیاری صاحب کو سید گل محمد شاہ صاحب نے عرض کیا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کو راضی کرکے لے آئیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے ان سے بھی معذرت کی۔

ہم نے بارہ پندرہ سال پہلے ''بیداری'' سندھی کا محمد بن قاسم نمبر شایع کرنے کا پروگرام بنایا۔ محمد بن قاسم کے سندھ کے حملے کے متعلق اور راجا داھر کے کردار کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کو تفصیلی مضمون لکھنے کی درخواست کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب

نے مضمون تحریر کیا، جو ایک نہایت ہی تحقیقی مضمون تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ مضمون آپ میرے نام سے شایع نہ کریں، بلکہ کسی اور کے نام سے شایع کردیں۔ ہم نے مضمون کو کسی کا نام دیے بغیر شایع کردیا۔ مضمون بہت پسند کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب، جب شاہ لطیف بھٹائی کے رسالے پر تحقیقی کام کر رہے تھے، ان دنوں ڈاک کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا، اس میں لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ شاہ لطیف پر لکھی گئی میری دس جلدوں کی اشاعت کی ذمہ داری آپ کا ادارہ سندھ نیشنل اکیڈمی اپنے ہاتھ میں لے۔ خط موصول ہوتے ہی میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کے گھر پر پہنچ گیا اور اپنے ادارے کے حالات سے ڈاکٹر صاحب کو واقف کیا کہ ہمارا تو سارا کام اللہ پر توکل کے سہارے پر چل رہا ہے۔ آمدنی کا کوئی بھی متعین ذریعہ نہیں ہے۔ کسی بھی کتاب کی اشاعت کا کام ہاتھ میں لیتے ہیں تو اس وقت تہی دست ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ جذبے کو دیکھ کر وقت پر کسی نہ کسی ذریعے سے کتاب کی اشاعت کا انتظام کردیتے ہیں۔ حال یہ ہے کہ اس وقت بھی کسی کتاب کی اشاعت کے لئے پیشگی کوئی رقم موجود نہیں ہے۔ جبکہ تقریباً ہماری ساری کتابیں اعزازی طور پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ ڈاک کا خرچ بھی خود کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر تعجب کا اظہار کیا کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ پیشگی اخراجات موجود نہ ہونے اور آمدنی کا متعین ذریعہ نہ ہونے کے باوجود بھی اتنا بڑا کام ہوسکتا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ مہران اکیڈمی والوں سے بھی ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا مگر مہران اکیڈمی والوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ معذرت کردی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں اپنے دوستوں کے ساتھ محبت کا پہلو بھی غالب تھا، جس کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ رہا۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر صاحب سندھ کی نگراں حکومت میں وزیر تعلیم تھے، میں نے اپنے ایک عزیز کی ملازمت کے سلسلے میں سندھ سیکٹریٹ میں جاکر، ان سے ملنے کی کوشش کی، ان کے دفتر کے باہر صبح سے ہی لوگوں کا اتنا رش تھا کہ میں نے ملاقات کیے بغیر واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ اتنے رش میں بظاہر ملاقات کی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر صاحب

بھی آگئے، اور اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی، مجھے ہاتھ سے پکڑ کر رش سے باہر نکال کر اپنے دفتر میں لے گئے۔ خیریت معلوم کی میں نے آنے کا مقصد بیان کیا، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ درخواست دیں، میں نے درخواست پیش کی، درخواست پر نوٹ لگا کر، کہا کہ آپ لاڑکانہ کے اسکولز کے ڈائریکٹر صاحب کے پاس جائیں، وہ آپ کو پوسٹنگ آڈر دیں گے۔

اسکولز کے ڈائریکٹر صاحب ادیب اور فاضل شخصیت تھے، وہ ڈاکٹر صاحب کے شاگرد بھی تھے، میرے علمی کام سے بھی واقف تھے، مگر وہ اس وقت ڈاکٹر صاحب سے کسی وجہ سے ناراض تھے۔ ایک دو دن انتظار میں رکھا، علمی گفتگو بھی ہوتی رہیں، مگر موصوف نے کام نہیں کیا۔ میں نے خط لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو ساری صورتحال سے واقف کیا۔ حسنِ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کو میرا یہ خط بروقت مل گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈائریکٹر صاحب سے آرڈر نکلوا کر ڈاک کے ذریعے مجھے بھجوا دیا۔ خط میں لکھا کہ میری عارضی وزارت اسی ہفتے میں ختم ہو رہی ہے، آپ لڑکے کو کہیں کہ وہ جلدی ملازمت جوائن کرے۔

اس قسم کا دوسرا واقعہ بھی ہے کہ ۔۔۔۔۔ جتوئی صاحب ہمارے کمپوزنگ سینٹر میں کمپیوٹر آپریٹر تھے، ایک دن اس نے کہا کہ سندھی لینگویج اتھارٹی میں کمپیوٹر آپریٹرز کی خالی ملازمتوں پر بھرتیاں ہو رہی ہیں، آپ اگر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب (جو اس وقت ڈائریکٹر تھے) کو میری سفارش کردیں، میں ساری زندگی آپ کا احسانمند رہوں گا۔ میں ان کو ساتھ لیکر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس خالی اسامیاں تو ہیں، مگر آپ اگر ان کی بہتر کمپیوٹر آپریٹر ہونے کی ضمانت دیتے ہیں تو ہم ان کو ملازمت میں رکھ لیتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے جتوئی صاحب کو اتھارٹی میں ملازمت دے دی۔

ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے اور بھی کئی واقعات ہیں، اگر وقت ملا تو ان کو قلمبند کروں گا۔

پانچ سات ماہ پہلے ڈاکٹر صاحب نے کال کی کہ میں آپ سے ملنے آپ کے دفتر آنا چاہتا ہوں۔ میرے فلاں بندے کو آپ ایڈریس سمجھا دیں۔ میں نے ان کو ایڈریس سمجھایا، مگر وہ یاد نہ کر سکے، ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی میں آدھ ایک گھنٹہ اِدھر

اُدھر کے چکر لگا کر واپس اپنے گھر پہنچ گئے، فون پر معذرت کی کہ کافی کوشش کے باوجود آپ کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد پھر عید آ گئی۔ عید کے دوسرے دن ہی میں ڈاکٹر صاحب کو فون پر اطلاع دیئے بغیر ان کے گھر پہنچ گیا، مگر کسی وجہ سے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اس سلسلے میں، میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھا، جس کی نقل میرے پاس اب موجود نہیں ہے، پتا نہیں اس میں کیا الفاظ لکھے گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس خط سے نہ جانے کیسے یہ باور کرلیا کہ میں ان سے ناراض ہوں، ڈاکٹر صاحب نے، ڈاکٹر عبدالجبار عابد صاحب کو فون کرکے کہا کہ سائیں محمد موسیٰ بھٹو صاحب ناراض ہو گئے ہیں، مجھے ان سے ملوا دیں۔ عابد صاحب نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا، میں نے ان سے کہا کہ میرے خط کے نہ جانے کن الفاظ سے ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت سے ناراضگی؟

ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ ذیل خط میں اس ناراضگی کی طرف اشارہ ہے۔

عید الفطر سال ۱۴۳۰ ہجری مبارک

سائیں محمد موسیٰ سلامت ہوں۔

السلام علیکم!

آپ کا ہدایت نامہ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۴۰۰ ہجری مجھے مل گیا ہے۔ اور بھی مزید ہدایت کی ضرورت ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق نصیب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ رمضان شریف میں اور اس سے دو تین ہفتے پہلے اگر کسی ''دوست'' کو میں یاد کر رہا تھا تو وہ آپ ہی تھے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی کہ جو ہوا سو ہوا اور میں آپ سے نہ مل سکا۔ اسباب ایسے ہیں جو اگر بیان کئے جائیں تو اس کے لئے متنبّی کا شعر ہے کہ: ''**فانی اذا ما اعتذرت الیک ارد اعتذاری اعتذار.**''

یعنی ایک عذر بیان کرنے سے دوسرا پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا کرم کرے، تاکہ خیر و عافیت پیدا ہو۔

مخلص

نبی بخش

سندھ یونیورسٹی

حیدرآباد، سندھ

میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے کافی خطوط موجود تھے، مگر فائلوں میں سے گم ہوگئے ہیں۔ ان کا لکھا ہوا ایک خط میری کتاب ''جیکی ڈٹھو آ موں'' کے اداریے میں شایع ہوا ہے۔ یہ کتاب اکتوبر ۱۹۸۹ء کو شایع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ۱۹۸۶ء کے دور کا ہے۔

جناب محترم محمد موسیٰ بھٹو صاحب

السلام علیکم!

بے حد ممنون ہوں کہ آپ سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ کی شایع کردہ کتابیں مجھے ارسال کرتے رہتے ہیں۔ روشنی کی طرف سفر اور جدید علم کا چیلنج ابھی موصول ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت بھی مبارک ہو۔ سندھ نیشنل اکیڈمی پہلا ادارہ ہے، جس نے موجودہ دور کے مسائل کو ایک بہتر طریقے سے اپنے اشاعتی پروگرام کے ذریعے عام فہم سندھی زبان میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی محنت اور آپ کے حوصلے کو آفرین! ہمارے مختلف اشاعتی ادارے اگر اس طرح کارآمد موضوع کا انتخاب کرکے، اور اس سلسلے میں کسی بہتر سلیقے اور تجویز کے ساتھ کتابیں شایع کریں تو یہ ایک بڑی علمی خدمت شمار ہوسکتی ہے۔ بہرحال آپ نے اس طرف کامیابی کے ساتھ قدم بڑھایا ہے، اور دوسروں کے لئے ایک اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ آپ کی کتاب جدید سندھ کے مسائل اور ان کا حل، کافی عرصے پہلے موصول ہوئی ہے۔ اور میرے زیر مطالعہ رہی ہے۔ آپ نے سندھ کے اخبارات میں سے جو اقتباسات اس کتاب میں مرتب کیے ہیں، وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کام کو جاری رکھیں گے۔ ہمارے لئے یہ کتاب اور اس جیسی دوسری کتابیں تاریخی آئینہ ہیں۔ اہلِ علم کے لئے بڑا سبق ہے۔ **(ماخوذ: سندھی بیداری مئی ۲۰۱۱ء)**

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص

نبی بخش بلوچ

مولانا شمس الرحمٰن

مولانا شمس الرحمٰن صاحب ہمارے سلسلہ کی ممتاز بزرگ ہستی مونا عبدلغفورمدنیؒ کے نہایت قریبی عزیزوں میں شمار ہوتے ہیں اور طویل عرصہ سے غفوریہ مسجد، جونا بازار میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا، صاحب وجاہت شخصیت ہیں، گھنی ڈاڑھی، جو سینہ کو چھپا رہی ہے، عمامہ باندھا ہوا، چہرہ ایسا نورانی کہ بس دیکھتے رہنے کو جی چاہنے لگتا ہے، سنجیدگی ووقار کی حامل شخصیت، کم بولنے کی ادا، ہم جیسا باہر سے آنے والا فرد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے گا تو مصافحہ میں گرم جوشی کے ساتھ چہرہ پر مسکراہٹ بھی چھاجائے گی، ویسے عمومی مصافحہ میں گرم جوشی میں کمی کا ہونا، اس لئے کہ ہر نماز کے وقت گھر سے آتے وقت مصافحہ کے انتظار میں کھڑے افراد کی قطار لگ جاتی ہے، عمر رسیدہ شخص کے لئے یہ امتحان ہوتا ہے کہ کسی سے گرم جوشی کا مظاہرہ کرے اور کسی سے نہ کرے۔

مولانا کے مریدوں کا وسیع حلقہ ہے، جمعہ کے ہفتہ وار حلقہ میں لگ بھگ سارے نمازی ذکر میں شامل ہوتے ہیں، اتنی بڑی جامع مسجد کے نمازیوں کا مولانا کی شخصیت کے ساتھ اتنی عقیدت اور اتنا اعتماد کا ہونا کہ ان کے حلقہ، ذکر میں شامل ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، بڑی بات ہے۔

رمضان شریف میں ان کے ہاں اعتکاف بھی ہوتا ہے، اعتکاف میں اندرون سندھ کے ان کے مرید بھی شریک ہوکر، دس دن تک اپنے مرشد کی صحبت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

مولانا کی ملفوظات کی کتاب بھی شایع ہوئی ہے، جس سے ان کی باطنی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، موصوف کی تقریر بڑی مؤثر اور معلوماتی ہوتی ہے، انیسویں صدی اور

بیسویں صدی کے اکابر بزرگوں کے حالات کے بارے میں جب وہ بیان کرتے ہیں تو سننے والوں کے سامنے ان کی پاکیزہ زندگی کا نقشہ آجاتا ہے۔

موصوف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مسائل اور پریشانیاں سننے اور انہیں سہارا دینے کے لئے وقت نکالتے ہیں، اگر تعویذ کی ضرورت ہوتی ہے تو انہیں تعویذ بھی دے دیتے ہیں، اس کے لئے وقت مقرر کئے ہوئے ہیں۔

مولانا موصوف کی ایک ادا یہ ہے کہ وہ تصوف کے ساتھ ساتھ تبلیغی جماعت سے بھی گہری وابستگی رکھتے ہیں، سالانہ چلہ دیتے رہے ہیں، کراچی کے مرکز میں ہفتہ وار اجتماع میں پابندی سے شریک ہوتے رہتے ہیں، اپنے مریدوں کو بھی تبلیغ کے لئے وقت نکالنے کی تاکید فرماتے رہتے ہیں، ان کی ''غفوریہ مسجد، میں صبح وشام تبلیغی ساتھیوں کا حلقہ ہوتا ہے، صبح کے حلقہ میں وہ باقائدہ شریک ہوتے ہیں، تبلیغی جماعت سے اتنی گہری وابستگی کے نتیجہ میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تبلیغ سے وابستہ افراد کے تزکیہ اور روحانی اصلاح کے لئے صاحب روحانیت شخصیت موجود ودستیاب رہی، چنانچہ تبلیغی جماعت کے سینکڑوں افراد مولانا کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں اور ذکر ومراقبہ کی وجہ سے ان کی اصلاح کی بہتر صورت پیدا ہوئی ہے۔

ہم نے مولانا شمس الرحمٰن صاحب کو اپنے مرشد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی مجلس میں متعدد بار دیکھا ہے، دونوں کی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کی تکریم کرنے کا منظر قابل دید ہوتا تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کی کوشش کررہے ہوتے تو مولانا صاحب تیزی سے ان کے ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر بوسہ دینے میں کامیاب ہوتے۔

اس وقت مولانا کے چہرے پر ابھی سفید بال نہیں آئے تھے، اس وقت ان کے چہرے کی رونق دوچند تھی، مغرب کی نماز کے سلسلہ میں حضرت ڈاکٹر صاحب کی کوشش ہوتی تھی کہ مولانا شمس الرحمٰن صاحب پڑھائیں، لیکن مولانا موصوف اپنی اداؤں سے یہ

ثابت کر رہے ہوتے تھے کہ میں تو ڈاکٹر صاحب کی زیارت وصحبت واصلاح کے لئے آیا ہوں، نہ کہ امام بننے کے لئے، چناچہ مجھے یادنہیں ہے کہ وہ اصرار کے باوجود کبھی بھی حضرت ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں امامت کے لئے آگے بڑھے ہوں، حضرت ڈاکٹر صاحب کو مولانا عبدالغفور مدنیؒ سے بے پناہ محبت تھی، بلکہ ڈاکٹر صاحب کو حضرت زوار حسین شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ سے بھی خلافت حاصل تھی، حضرت ڈاکٹر صاحب اس اعتبار سے بھی مولانا شمس الرحمٰن صاحب سے محبت کا خصوصی معاملہ فرماتے تھے، جب کہ مولانا شمس الرحمٰن صاحب ڈاکٹر صاحب کی غیر معمولی روحانی شخصیت کے دل سے قدر دان تھے۔

مولانا شمس الرحمٰن صاحب کی عاجزی وانکساری کا یہ منظر ایک بار اور بھی دیکھنے کا موقعہ ملا، ہوا یہ کہ ہمارے مخلص ساتھی عبدالکریم گاندھی صاحب نے اپنے نئے مکان، جو غفوریہ مسجد کے قریب تھا، وہاں ذکر ومراقبہ کی پہلی تقریب منعقد کی، اس تقریب میں حضرت نثار احمد خان صاحب، حاجی محمد انیس صاحب، پیر شفیع اللہ صاحب وغیرہ بھی شریک ہوئے، پروگرام مغرب کے بعد تھا، ہم نے عصر کی نماز غفوریہ مسجد میں پڑھی، اس کے بعد مولانا شمس الرحمٰن صاحب کے ساتھ ملاقات کی نشست تھی، ملاقات ہوئی، رخصت کے وقت مولانا موصوف نے جھک کر حضرت نثار احمد صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، مجھے تو اس میں ان کی اپنی ہی عظمت نظر آئی۔

یہ فنائیت کی علامت ہے، فنا کا حامل بزرگ اپنے آپ کو لاشی سمجھتا ہے۔

اس وقت اگرچہ مولانا کی عمر ۶۴ سال ہے، لیکن عمر رسیدگی کے آثار غالب ہیں، شگر وبلڈ پریشر کی شکایت کے باوجود مولانا کے معمولات میں کمی واقع نہ ہوئی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بزرگوں کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

مولانا الطاف الرحمٰن

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب عالم دین ہیں، صاحب فضل شخصیت ہیں، زندگی بھر قال اللہ وقال الرسول کا فریضہ سرانجام دیتے رہے ہیں، دین کا درد رکھنے والی متحرک شخصیت ہیں اور انقلابی سوچ کے حامل بھی۔

موصوف جامعہ اشرفیہ لاہور کی فارغ تحصیل ہیں، اور انہیں وقت کے اکابر علماء وبزرگوں کی صحبت نصیب رہی، ان کی ساری ذہنی نشو ونما دیوبند مکتبہ فکر کے علماء کے زیر اثر ہوئی، مولانا تھانوی کی کتابوں کے گرویدہ رہے ہیں۔

ذہین اور متحرک شخصیت ہونے کی وجہ سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے قریب ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے بالخصوص اپنی اولاد اور طلبہ کو ان کے علمی فیوض سے بہرہ ور ہونے کے لئے انہیں قرآن کالج میں استاد کی حیثیت سے کام کرنے پر آمادہ کیا، موصوف تین سال تک ''قرآن کالج'' لاہو میں اسلامی علوم پڑھاتے رہے، حافظ عاکف سعید صاحب (جو ڈاکٹر موصوف صاحب کے فرزند ہیں) وہ مولانا الطاف الرحمٰن کے شاگرد رشید ہیں، اور ان کے علوم اور صحبت سے فیضیاب ہیں، موصوف اب تک اپنے استاد سے محبت کا گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب مختلف مدارس میں خدمات سرانجام دینے کے بعد پچھلے بائیس سال سے جامعہ امداد العلوم (درویش مسجد) پشاور میں پہلے مدرس بعد میں صدر مدرس کی حیثیت سے فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ اس وقت موصوف پشاور کے دو دینی مدارس میں صحاح ستہ اور بیضاوی کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ موصوف کے سینکڑوں سے زیادہ شاگرد ہیں، جو اس وقت صوبہ بختونخواہ میں دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

صوبہ کے درس نظامی کے حلقوں میں مولانا کی درس وتدریس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا ہے۔

اگرچہ مولانا کا دائرہ کار درس وتدریس اور مسجد میں خطابت کا ہے، لیکن دین اسلام کی مظلومیت ، ملت اسلام کی حالت زار اور مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی یلغار، ان کی دینی حمیت میں اضافہ کا موجب بنتی ہے، افغانستان میں روس کے خلاف جہاد میں بھی مولانا نے بھرپور حصہ لیا، بعد میں مولانا حقانی صاحب (جو مجاہدوں کی ایک تنظیم کے سربراہ تھے) انہوں نے موصوف کو اپنے شعبہ یعنی درس وتدریس میں کام کرنے کی تاکید کی۔

آٹھ دس سال پہلے پشاور سے مولانا کا فون آیا اور خط بھی، کہ آپ اپنی ساری کتابیں مجھے وی پی کردیں، مجھے حیرت ہوئی کہ علماء کرام تو عام طور پر ہماری کتابوں کے بارے میں اس طرح کے تحرک وحساسیت کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ ہم خود پیش قدمی کرکے نمایاں علمائے کرام کی خدمت میں اپنی کتابیں مسلسل بھیجتے رہے ہیں، ان کی طرف سے عام طور پر کتابوں کی وصولی کی رسید تک موصول نہیں ہوتی، اس طرح کی فضا میں یہ عجیب عالم دین ہیں،جو ہماری کتابوں سے اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ ساری کتابیں پیسوں سے منگوا رہے ہیں۔

ہم نے مولانا کے شوق وجذبہ کو دیکھ کر ان کی خدمت میں ساری کتابوں کا سیٹ اعزازی طور پر بھیج دیا، مولانا نے کتابوں کی وصولی کی رسید بھی ارسال کی اور ساتھ ساتھ کتابوں کی رقم تو نہیں،لیکن ہمارے ادارہ کے ساتھ تعاون کے طور پر کچھ رقم ارسال کردی۔

اس طرح مولانا سے ہمارا ابتدائی تعلق پیدا ہوا، اس کے بعد اس تعلق میں مزید اضافہ ہوتا رہا، یہ مولانا کی انکساری ہے کہ اپنی ممتاز علمی ودینی حیثیت ہونے اور صحاح ستہ اور بیضاوی جیسی بنیادی کتابیں پڑھاتے رہنے اور شاگردوں میں مقبول ہونے کی باوجود وہ ہم جیسے غیر عالم اور صرف لکھنے کی مشق رکھنے والے اہل قلم سے محبت کا تعلق قائم رکھتے ہیں اور اس تعلق میں اضافہ کے لئے کوشاں رہے۔

اس کا ایک بڑا سبب فکری وعلمی ونظریاتی یک جہتی بھی ہے، ڈاکٹر اسرار احمد کی صحبت اور مولانا مودودی کی کتابوں کے مطالعہ کی بنا پر وہ ہماری طرح اس فکری مغالطہ

کا شکار ہوگئے تھے کہ دین کا نصب العینی کام حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے جدوجہد کا کام ہے، باقی سارے کام اس نصب العین کی بجا آوری کا ذریعہ ہیں، اگر یہ نصب العینی کام نہ ہوتو دین کے دوسرے سارے کام، تزکیہ نفس کی کوششیں، ذکر وفکر وعبادت میں انہماک جیسے سارے کام بے وقعت ثابت ہوں گے، اس لئے کہ اصل نصب العینی کام کے لئے تو جدوجہد ہوئی نہیں۔

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب کے لاشعور میں مولانا تھانوی کے مکتبہ فکر کی جامعہ کے فاضل استادوں کی صحبت کے اثرات موجود ہونے کی وجہ سے ان کے اندر شدت سے یہ اشکال پیدا ہوا کہ کہیں دین کا یہ نصب العینی تصور غلط تو نہیں، اس اشکال کو دور کرنے کے لئے مولانا موصوف نے ہماری کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، چونکہ یہ عاجز بھی اپنی ابتدائی عمر کے تیرہ سال اس فکری سانچہ کے زیر اثر تھا، برسوں کے طویل مطالعہ اور اہل اللہ کی صحبت نے اس فکری سانچہ سے نکال کر، سلف کے اسلام کے اس نصب العینی فکر وپیام پر یقین کامل عطا کیا کہ اسلام کا نصب العین اللہ کی مخلصانہ عبادت ہے، اور اللہ سے مستحکم تعلق قائم کرنا ہے، اس مخلصانہ تعلق کے نتیجہ میں تزکیہ نفس بھی ہوگا تو فکر آخرت بھی پیدا ہوگی، اخلاق حسنہ کی سعادت بھی حاصل ہوگی، اللہ سے محبت کی فضا بھی پیدا ہوگی توحمیت دین بھی حاصل ہوگی، اور اسلامی شریعت پر عمل ہونے میں آسانی بھی پیدا ہوگی، نیز اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اخلاص کے ساتھ جدوجہد کا سلیقہ بھی اسی سے پیدا ہوگا، چونکہ اسلامی قوانین کے غلبہ کا کام دین کا ایک اہم فریضہ ہے، جسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس کے لئے بھی کوشش ہونا ضروری ہے، لیکن اس فریضہ کی سرانجامی کا تعلق افراد اور معاشرہ کی تبدیلی سے ہے، فاسد معاشرہ میں جب تک افراد کے تزکیہ کے لئے ہمہ جہتی کام نہ ہوگا اور معاشرہ، اخلاقی اور روحانی طور پر ایک حد تک تبدیل نہ ہوگا، تب تک اقتدار کے ایوانوں میں ہونے والی تبدیلی کے ذریعہ اسلامی قوانین کے نفاذ کا کام نتیجہ خیز ثابت ہوسکے، دشوار تر ہے۔

الحمدللہ ہماری کتابوں میں تزکیہ نفس، اسلامی قوانین کے غلبہ کی جدوجہد کے

کام، معاشرہ کی تشکیل نو میں تصوف کے کردار جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث موجود ہے، حضرت مولانا الطاف الرحمٰن صاحب نے ہماری کتابوں کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور موصوف نے اپنی عالمانہ حیثیت کو مجروح کرکے بھی ہم جیسے غیر عالم اور محض لکھنے کی مشق رکھنے ولے عامی فرد سے محبت کا تعلق قائم رکھا۔

اس سلسلہ میں موصوف نے اپنے مدرسہ جامعہ امداد العلوم میں دو بار ۲۰۱۲ اور ۲۰۱۳ء میں ہمارا اس طرح پروگرام رکھا کہ صبح سے رات تک چار چار پروگرام رکھے، اور ہر سطح کے طلبہ سے ہماری نشستوں کا اہتمام کیا۔

مولانا کی شخصیت کے حوالے سے یہ گفتگو اس لئے ہوئی کہ باصلاحیت افراد کا ایک طبقہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے غلبہ اسلام کے لئے اپنی توانائیاں صرف کررہا ہے، لیکن بدقسمتی سے معاشرہ ہے کہ تیزی سے دوسری سمت جارہا ہے اور معاشرہ میں غلبہ دین کی اس تحریک کے اثرات بہت کم ہیں، اس کا ایک اہم سبب تزکیہ نفس کا فقدان اور اللہ کی محبت کے رازدانوں سے دوری ہے۔

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب نے ہماری کتابوں کو مدرسہ کے طلبہ کے لئے مفید سمجھا اور ''اللہ کے طالب کا سفر'' اور ''انسانی شخصیت میں نصب بت'' وغیرہ کافی تعداد میں منگوا کر طلبہ کو برائے نام قیمت پر دیئے، ان کتابوں کے بعد جب دوسال پہلے ہمارا مولانا کے مدرسہ میں جانا ہوا اور بڑی سطح کے طلبہ کے ساتھ ہماری نشست ہوئی تو طلبہ نے کتابوں میں دی گئی فکر کے حوالے سے سوالات کئے۔

غالباً یہ پہلا موقعہ ہے کہ ملک کی کسی جامعہ کی ذمہ دار شخصیت نے ہماری کتابوں کو اپنی جامعہ کے طلبہ میں پھیلانے کے سلسلہ میں اس طرح کی سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہو۔

یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اس عاجز کو سارے کاموں سے یکسو ہو کر، نئے دور کے چیلنج کے فہم اور اس چیلنج سے مقابلہ اور تزکیہ نفس کی فیصلہ کن اہمیت اور تصوف واہل تصوف کو جدید دور کی علمی وذہنی سطح کے مطابق پیش کرنے کے کام پر لگایا، الحمداللہ ان موضوعات پر سیر حاصل لٹریچر تیار ہوگیا، مولانا موصوف نے ہمارے اس

لٹریچر کی افادیت کو محسوس کرکے اسے اپنے حلقہ میں پھیلانے میں تعاون فرمایا۔

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب کو تبلیغ جماعت سے یہ شکایت ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ جہاد وقتال کی اہمیت کے قائل نہیں، بلکہ بعض اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں، جس سے اسلام میں جہاد کی اہمیت متاثر ہوئی ہے، اس سلسلہ میں مولانا کو ذاتی طور پر ایسے تجربات ہوئے اور غلو کے حامل تبلیغوں سے واسطہ پڑا، جس سے تبلیغ کے بارے میں ان کے اس موقف میں استحکام پیدا ہوا۔

یقیناً تبلیغی جماعت پر دعوتی کام کا غلبہ ہے، اس کام کے علاوہ دین کے دوسرے کاموں کی ان کی نظر میں عام طور زیادہ اہمیت نہیں ہے، دینی علوم سے بے بہرہ عام تبلیغیوں کی اس سلسلہ میں جو حالت ہے، وہ افسوسناک ہے، لیکن چونکہ تبلیغ سے وابستہ افراد کو دین پر عمل پیرا ہونے کی جو بھی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ تبلیغی جماعت سے وابستگی کے نتیجہ میں ہی ہوئی ہے، اس لئے وہ تبلیغی کام کے سلسلہ میں غلو پر معذور سمجھے جائیں گے، مولانا نے تبلیغی جماعت کی اس کمی پر ایک کتاب بھی لکھی ہے، ہماری نظر میں یہ کتاب مولانا کے احساس شدت کا نتیجہ ہے، اس لئے کہ تبلیغی جماعت نے دعوتی کام کے ذریعہ عالمی سطح پر دین کے لئے میلانات ورجحانات کے فروغ کے لئے جو کردار ادا کیا ہے، اور نئی نسلوں کو جس طرح اسلامیت کی طرف راغب کیا ہے، وہ ایسا کام ہے جو ان کے نقائص پر بھاری کام ہے، ہم ساری کاوشوں کے باوجود اپنے عزیز نوجوانوں کو نماز جیسے بنیادی فرض کا عادی بنانے میں ناکام ہیں، جب کہ ہمارے اپنے نوجوان جب تبلیغ سے وابسطہ ہوجاتے ہیں تو ان کی نماز کی ازخود پابندی شروع ہوجاتی ہے، اور ان کی وضع قطع بھی شرعی ہوجاتی ہے۔

پھر موجودہ دور میں جہاد وقتال کے نام پر جو کچھ ہورہا ہے، وہ اسلام جیسے رواداری والے دین کے لئے ایک المیہ سے کم نہیں، جہاد کے دعویدار گروہ مسلمانوں کی گردنیں اڑانے اور اپنے سے مخالف نقطہ نگاہ رکھنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے، لیکن اچھے خاصے پڑھے لکھے جدید اسلامی فکر کے دانشور جہاد کے اس تصور کی دعوت دیتے رہے ہیں کہ مسلمان ممالک کے حکمران، فوج، پولیس اور ساری

انتظامیہ چونکہ عالمی سامراج کے قائم کردہ نظام اور اس کی تہذیب کی علمبردار ہے، اس لئے جہاد وقتال کے ذریعہ اس کا قلع قمعہ کرنا ضروری ہے۔

ہماری نظر میں یہ تبلیغیوں اور جہادیوں دونوں طرف سے افراط وتفریط کی روش ہے، مولانا موصوف کی خواہش ہے کہ دونوں طبقوں میں توازن واعتدال پیدا ہو، اسلام نے جہاد کو جو اہمیت دی ہے، اس کو وہی اہمیت دی جائے، اسی طرح جہاد وقتال کے نام پر مسلمانوں کے قتل کی روش اسلام کی بدنامی اور مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور امت مسلمہ کو تقسیم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب کا درس وتدریس یعنی دینی علوم کی تدریس سے جنون کی حد تک تعلق ہے، موصوف تیس سال تک رمضان شریف میں دورہ تفسیر پڑھاتے رہے ہیں، اپنے ایک فرزند کو دارالعلوم کراچی میں داخل کیا اور وہ فرزند وہاں سے فراغت کے بعد ایک کالج میں لیکچرار ہوگئے، جس پر مولانا کو دکھ ہوا کہ ان کی قیمتی زندگی جدید تعلیمی اداروں میں صرف ہوگی اور حقیقی خدمت دین کی سعادت سے محرومی ہوگی، فرنگی تعلیمی ادارہ کے اثرات سے خلط ملط ہوگی، چنانچہ مولانا کے اصرار پر انہوں نے جزوی طور پر عربی کتابوں کی تدریس کا کام شروع کردیا ہے۔

مولانا اس عاجز کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے ہیں، موصوف نے ذکر وفکر بھی شروع کردیا ہے، جس سے ان پر ذکر وفکر کی اہمیت پوری طرح اجاگر ہوئی ہے، اور عشق ومحبت کے اسرار کھلنا شروع ہوگئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عشق ومحبت کی سعادت انہی کو حاصل ہوتی ہے، جو اس کے مستحق ہوتے ہیں، جن کی خدمت دین کی ادائیں یا دوسری کوئی ادا پسند آجاتی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰنؒ حبیب

مولانا حاجی حبیب الرحمٰن حبیب صاحب رمضان مبارک میں انتقال فرما گئے اناللہ وانا الیہ راجعون۔

''بیداری'' جولائی کے شمارے میں ان کا ذکر خیر ہوا تھا کہ ہماری معلومات کے مطابق ملک میں جو صاحب فقر درویش موجود ہیں، ان میں مولانا حبیب الرحمٰن حبیب صاحب بھی ہیں۔

مولانا موصوف ابھی نویں جماعت میں تھے کہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب سے بیعت ہوگئے، فرماتے تھے کہ اس وقت سے ذکر کا ایسا غلبہ ہونا شروع ہوا کہ دنیا کے کسی کام سے تعلق خاطر باقی نہ رہا اور قلب پر ہر وقت ذکر ہی کی فضا غالب رہتی تھی، اگرچہ تعلیم کے لئے وقت نہ نکلتا تھا، لیکن ساری تعلیم کے دوران اولین پوزیشن حاصل ہوتی رہتی۔ تکمیل تعلیم کے بعد اسکول میں سروس رہی، سروس کے دوران بھی ذکر کا غلبہ رہا، اسی غلبہ ذکر کی حالت میں طلبہ کو پڑھانے کا سلسلہ ہوتا، الحمدللہ میرے کلاس کے شاگرد، امتحان میں سب سے آگے ہوتے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا کافی وقت عرصہ تک روزانہ کا آٹھ دس گھنٹے کے مراقبہ کا معمول رہا، جس نے ان کی شخصیت کو سراپا سوز بنا دیا تھا۔ موصوف نے تیس کتابیں لکھیں، ساری کتابیں تصوف، فکر آخرت اور اصلاح نفس کے موضوع پر ہیں۔ ان کتابوں میں سے کچھ کے نام یہ ہیں ''کشکول حبیب'' ''عوارف المعارف'' ''فکر آخرت'' ''تحریف انوار طریقت'' ''انوار ولایت شمسیہ'' وغیرہ۔

آخری کتاب حضرت خواجہ شمس الدین سید پوری کے حالات زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے خلفاء کے حالات پر ہے۔ حضرت خواجہ شمس الدین سید پوریؒ، مولانا عبدالحی مدظلہ کے والد صاحب ہیں، اور حضرت آدم بنوریؒ کے سلسلہ سے تعلق

رہا، اس سلسلہ کی ایک اہمیت یہ ہے کہ ہندوستان کی دوبڑی اور طاقتور روحانی شخصیتوں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت سید احمد شہید کا اسی سلسلہ سے تعلق رہا۔

حضرت خواجہ شمس الدین سید پوری نے کشمیر، ہزارہ، بٹ گرام اور کوہستاں میں بہت کام کیا، اس علاقہ میں اس وقت بھی ہزاروں افراد روحانی اصلاح کے حوالے سے مولانا عبدالحی صاحب سے وابستہ ہیں۔ حضرت سید پوریؒ نے اپنے فرزند مولانا عبدالحی صاحب مدظلہ کی فطری صلاحیتوں اور استعداد کو دیکھکر انہیں ۲۰،۱۸ سال کی عمر میں ہی خلافت عطا کردی تھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن موصوف پر ذکر کی محویت ایسی طاری رہتی تھی کہ وہ مجلس میں اکثر دل کی طرف متوجہ رہتے تھے، کسی نے سوال کر دیا تو جواب دیدیتے تھے، ورنہ سارا وقت اندر میں غوطہ زن رہتے تھے۔

موصوف حضرت خواجہ عثمان ہارونی اور حضرت سلطان باہو کا کلام اس سوز وگذار سے پڑھتے تھے کہ طالب کیفیات سے مغلوب ہوجاتے تھے، جیسا کہ بیان کیا گیا کہ مولانا موصوف (حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے عزیز تھے) ان کی خانقاہ میں طالبوں کی تربیت کا کام فرماتے تھے، ضلع مانسہرہ میں یہ خانقاہ، فقر وسادگی کا مثالی نمونہ ہے، موصوف کی تصوف کے موضوع پر لکھی گئی کتابیں سادہ زبان میں اہم کتابیں ہیں، ان کتابوں میں تصوف کی بنیادی اسلامی تعلیمات کو انہوں نے نہایت بہتر اور مؤثر طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے عام فرد بھی تصوف کی حقیقت اور اس کے بنیادی اصولوں اور صحیح تصوف کے اصل خطوط سے پوری طرح آشنا ہوجاتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب میں سادگی، نمایاں نہ ہونے کی ادا، اپنے کچھ بھی نہ ہونے کا احساس غالب تھا، آخری سالوں میں استغراق کی حالت غالب تھی، انہیں دیکھکر بظاہر ان کے بڑے اہل اللہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنا دشوار ہوجاتا تھا، اس لئے کہ ان کی کوئی ایک ادا بھی تو ایسی نہیں تھی، جو موجودہ دور کے پیروں سے میل کھاتی ہو۔

تین چار سال پہلے مولانا احسان الحق صاحب کے سالانہ پروگرام میں صبح کی نشست میں مراقبہ کے بعد سامعین اس عاجز سے ملے، مولانا بھی ملے، اپنا نام صرف حبیب الرحمٰن بتایا، میں نے خیال کیا کہ کوئی حبیب الرحمٰن صاحب ہوں گے، اس لئے میں نے توجہ نہیں کی، لیکن جب مولانا احسان الحق صاحب کے کمرہ میں گئے تو وہاں دوسرے افراد کے ساتھ مولانا بھی غیر نمایاں جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے پوچھ لیا، فرمایا، جی ہاں، مجھے حبیب الرحمٰن کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں اپنی کتابوں کا سیٹ ارسال کیا تھا۔

میں نے معذرت کی کہ آپ نے تعارف تو کرایا تھا، لیکن اپنے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ نہ ہونے اور آپ کی غیرمعمولی سادگی کی وجہ سے میرا ذہن اس طرف نہ گیا۔

مولانا احسان الحق صاحب کے پروگرام میں موصوف دو دن تک موجود رہے، دوسرے سال بھی تشریف لائے، لیکن سامع کی حیثیت سے تقریریں سنتے رہے، خود تقریر نہیں فرمائی۔ معلوم ہوا کہ ان کی شخصیت میں مقرر کی حیثیت سے سامنے آنے اور نمایاں ہونے کی طلب، بالکل بھی نہیں ہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی کتابیں پڑھنے اور ان کی صفات اور خوبیوں کے بارے میں سنتے رہنے کے بعد آرزو تھی کہ دوچار ہفتے حضرت مولانا عبد الحی صاحب مدظلہ کی خانقاہ میں رہ کر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی صحبتوں سے متمتع ہوا جائے اور ان سے کچھ حاصل کیا جائے۔ یہ آرزو کافی شدید رہی، اس لئے کہ اس دور میں ہمارے مزاج کے حامل فقیر منش درویش جنہیں دنیا واہل دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو، جو ہر وقت دستیاب ہوں، جن پر فنا کی حالت غالب ہو، ان کا ملنا دشوار تر ہے، اس آرزو کے باوجود اپنی صحت کچھ ایسی ہے کہ سفر سے ڈر لگتا ہے، کچھ اعصابی نظام کے غیرمعمولی طور پر مضمحل ہونے کا عذر، کچھ پیٹ کی مسلسل خرابی حائل رہی، ان کے وصال کی بات سن کر سخت صدمہ ہوا کہ جن کی صحبت کی آرزو تھی، وہ بھی رخصت ہوگئے۔

مولانا عبدالقدوس صاحب جو حضرو اٹک میں مدرسہ کے مہتمم ہیں اور جنہیں حضرت مسیح اللہؒ کی کچھ وقت صحبت حاصل رہی، جو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے خلیفہ مجاز بھی ہیں، انہوں نے بتایا تھا کہ میں روزانہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ ایک گھنٹہ مراقبہ کرتا ہوں، میں نے کہا کہ آپ تو اٹک میں رہتے ہیں، مولانا مانسہرہ کے گاؤں میں، ان کے ساتھ مراقبہ کیسے ہوتا ہے، کہنے لگے موبائل کے ذریعہ، مولانا اپنا موبائل کھول دیتے ہیں۔ میں بھی کھول دیتا ہوں، اس طرح ایک دوسرے کو موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے اور آخر میں وہ دعا کراتے ہیں۔ فرما رہے تھے، ان کے ساتھ مراقبہ سے مجھے غیرمعمولی نفع ہوتا رہا ہے، جو اپنے طور پر مراقبہ سے حاصل نہیں ہوتا۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مراقبہ پر غیرمعمولی زور دیتے تھے، فرماتے تھے، طالب کی ساری ترقی اسی سے ہوتی ہے۔ نسبت مع اللہ کا ملکہ اسی سے مستحکم ہوتا ہے۔ اس لئے طالب کو وقت ضایع کئے بغیر زندگی کے قیمتی لمحات سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کے اسم ذات کا وہ جتنا ذکر کرسکتا کرنا چاہئے۔ حضرت مولانا عبدالحی صاحب عام طور پر طالبوں کی تربیت کے لئے گفتگو زیادہ فرماتے ہیں، جب کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا طبعی رجحان یہ ہے کہ طالبوں کے مزاج میں ذکر کے ملکہ کو راسخ کرنے پر ہی زیادہ محنت ہونی چاہئے۔ تاکہ اس میں اخلاق حسنہ اور دنیا واہل دنیا سے بے نیازی کی نفسیات پیدا ہوجائے اور اس کے لئے شریعت آسان ہوجائے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب میں یہ نکتہ لکھا ہے کہ طالب کو چاہئے کہ وہ دنیا کے کم سے کم حصہ پر راضی ہوجائے، اور دنیا کے حوالے سے ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرنا چاہئے، اس طرح اسے زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے ذکر میں صرف کرنا چاہئے، تاکہ اللہ کے کثرت ذکر کی بدولت اس کی دائمی زندگی کی کامیابی کی صورت پیدا ہو سکے۔ اگر طالب دنیا کو زیادہ وقت دے گا تو وہ ذکر کے لئے زیادہ وقت نہ نکال سکے گا، سچا طالب تو وہی ہے جو کم سے کم دنیا پر راضی ہو کر اللہ کی راہ میں چلتا رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ساری زندگی مجاہدوں میں رہے، اسم ذات کے غیرمعمولی مجاہدوں نے انہیں اس دنیا سے زیادہ اُس دنیا کا فرد بنا دیا تھا، فقر، سادگی، زہد، قناعت اور استغنا، جیسی صفات جو سلف صالحین اور بزرگان دین کا ورثہ رہی ہیں مولانا ان ساری خوبیوں کی حامل شخصیت تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ **(آمین)** **(ماخوذ: بیداری اگست ۲۰۱۵ء)**

نثار احمد خان فتحیؒ

حضرت نثار احمد خان فتحی کا ۲ جولائی ۲۰۱۴ء کو ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون۔**

موصوف سے کافی عرصہ تک میرے قریبی تعلقات رہے، اس حوالے سے کچھ تاثرات پیش کر رہا ہوں۔

نثار احمد خان فتحی صاحب بہت ساری صلاحیتوں وخوبیوں کی حامل شخصیت تھے۔ وہ صوفی تھے، صاحب تصنیف وتالیف تھے۔ شاعر تھے، جدیدیت کے چیلنج سے آشنا تھے۔ ان موضوعات پر ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں موجود ہیں، جن سے ان کے وسعت مطالعہ، وسعت مشاہدہ اورحسن بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ موصوف،حالات حاضرہ سے واقف ہونے کے لئے اخبار کا تفصیل سے مطالعہ کرتے تھے۔ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک کا وقت اخبار میں صرف کرتے تھے، جس کی وجہ سے قوم ، ملت اور عالم اسلام کے حالات سے آگاہی کے سلسلہ میں وہ دوسرے بزرگوں اور صوفیوں سے نمایاں تھے۔

موصوف کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ مہمان نواز تھے، جس بزرگ کے بارے میں بھی معلوم ہوتا کہ وہ میرے ہاں آسکتے ہیں، اسے اپنے گھر پر بلا کر، دعوت کا خصوصی اہتمام کرتے۔ ان کی اہلیہ عرصہ ہوا، انتقال کر چکی تھی۔ ان کے فرزند اپنے اہل وعیال کے ساتھ مکان کے اوپر کے حصے میں رہتے تھے۔ صبح کا ناشتہ اور چائے وغیرہ وہ خود ہی بناتے تھے، اگر باہر سے کوئی مہمان آتا تو اس کے لئے بھی ناشتہ تیار کرتے، میں برسوں تک ان کے ہاں آتا اور رات انہی کے ہاں قیام ہوتا، صبح کو ڈبل روٹی، انڈے اور چائے کا اہتمام وہ اپنے ہاتھ سے کرتے، اس کے بعد برتن بھی دھودیتے، ہمیں اس میں مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ آخری چند سالوں میں انہیں عبدالرزاق صاحب اور ناصر صاحب جیسے مخلص ساتھی مل گئے تھے،جو مہمانون کی آمد کے

وقت ناشتہ اور کھانے وغیرہ کا گھر سے اہتمام کرکے آتے۔

میرے ان سے تعلقات اس وقت سے تھے،جب ابھی ان کے مریدوں اور متعلقین کا حلقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ آخری چار پانچ سالوں میں یہ حلقہ مستحکم ہوا۔ حضرت حاجی محمد انیس صاحب کو انہوں نے خلافت دی، محترم عبدالرزاق صاحب کے گھر پر ذکر کی ہفتہ وار نشست ہونے لگی۔ اس کے بعد ان کے خلفاء کی لسٹ میں کافی اضافہ ہوتا گیا۔

حضرت نثار احمد صاحب، چشتی سلسلہ کے بزرگ تھے، ان کے ہاں جہری ذکر تھا، جہری ذکر میں بھی لاالہ اور اللہ وغیرہ کی ایک ایک تسبیح تھی۔ جو ان کا معمول تھا، ان کے ہاں اسم ذات کے قلبی ذکر کا سلسلہ نہیں تھا۔ جب کہ نقشبندی سلسلہ کی بنیاد ہی اسم ذات کے قلبی ذکر پر ہے۔بعض اوقات کہتے کہ مجھے قلبی ذکر سے مناسبت نہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ قلب ذکر کرے، یہ مشکل ہے۔ شاید قلبی ذکر کرنے والوں کو وہم ہوتا ہے کہ ان کا دل اللہ اللہ کرتا ہے۔ مراقبہ کے موضوع پر جب راقم سطور کی کتاب آئی تو انہوں نے اس سلسلہ میں تفصیل سے اپنے اشکالات بیان فرمائے۔ اس عاجز نے عرض کیا کہ میرا موقف اور میرے دلائل وہی ہیں، جو کتاب میں بیان ہوئے ہیں، البتہ اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح سورج کی تیزی کے سامنے کھڑے ہونے سے حرارت کی شدت کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح دل کو اس طرف متوجہ کرنے سے وہ انوار الٰہی سے سرشار ہونے لگتا ہے۔

تصوف کے ساتھ ساتھ علمی دنیا سے گہری آشنائی اور جدیدیت کے فہم کی وجہ سے ان سے میری قربت کافی زیادہ ہوگئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ تم وعدہ کرو کہ کراچی جب بھی آؤ گے تو میرے ہاں ٹھہرا کروگے۔ لگ بھگ دس بارہ سال تک میں کراچی آمد کے موقعہ پر انہی کے ہاں قیام کرتا۔اکثر رات کو قیام کرکے صبح حیدرآباد کے لئے واپسی ہوتی،وہ اکثر ناشتہ کرنے کے بعد اجازت دیتے۔

بعض اوقات وہ اصرار کرکے دوپہر تک ٹھہراتے اور عبدالرزاق صاحب اور ناصر صاحب کو اجتماعی کھانے کی تیاری کے لئے کہتے، محترم حاجی محمد انیس صاحب بھی شریک ہوجاتے، پھر کھانے کے ساتھ روحانی مجلس جمتی تھی، بزرگوں کے واقعات بیان

ہوتے، حضرت نثار احمد صاحب خوبصورت آواز سے اپنے اشعار سناتے۔

موصوف کے جو معمولات دیکھے، وہ یہ تھے کہ صبح کی اذان سے آدھا گھنٹہ پہلے اٹھتے۔ تہجد کی دوچار رکعت پڑھکر ذکر واذکار کرکے نماز کے لئے چلتے، صبح کو ڈبل روٹی اور انڈہ وغیرہ خریدنے کے لئے دور کی دوکان چنتے تاکہ کچھ تفریح بھی ہوجائے۔ اس کے بعد عصر تک باقی وقت مطالعہ، تحریر یا ملاقاتوں اور آرام میں صرف کرتے، البتہ عصر سے مغرب تک مسجد میں تلاوت اور اوراد وغیرہ میں وقت صرف کرتے، رات کو دیر سے سونے کی عادت تھی، جب کہ میرے معمولات انہیں معلوم تھے کہ میں عشاء کی نماز پڑھ کر فورا سونے کا عادی ہوں، چنانچہ مجھے کہتے کہ آپ بھلے لیٹ جائیں۔

ان کے ہاں ہونے والی گفتگو میں سارے مسائل زیر بحث آتے، تصوف، بزرگوں کے حالات وواقعات، سیاست، ملک کی بگڑتی ہوئی اخلاقی صورتحال، دینی ومذہبی جماعتوں کے موجودہ کردار، حالات کے بدلنے کے سلسلہ میں اپنی بے بسی کا اظہار وغیرہ سب شامل ہوتا۔

موصوف کو ہر طرح کے بزرگوں اور درویشوں سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ بتاتے تھے کہ میں ملک بھر کے ۷۵ کے قریب بزرگوں سے مل چکا ہوں، لیکن میرے قلب میں موجود تشنگی کی دوری کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ حضرت مولانا خان محمد صاحب کے وصال سے دوسال پہلے ان کی خانقاہ میں پندرہ دن قیام کر چکے تھے۔ حضرت مولانا خان محمد صاحب نے انہیں حضرت مجدد الف ثانی کے مراقبہ جات کرنے کی تلقین کی، لیکن چونکہ موصوف کو زندگی بھر مراقبوں سے تعلق خاطر نہ رہا تھا، اس لئے وہ نہ کر سکے۔

صوبہ پختونخواہ کے کسی بزرگ نے اپنی ایک کتاب میں دعویٰ کیا تھا کہ جو خدا کی زیارت کرنا چاہتا ہے، میں اسے دعوت دیتا ہوں کہ وہ میرے یہاں آکر قیام کرے، میں اسے زیارت کرادوں گا۔ آپ نے ان بزرگ سے خط وکتابت کی اور ان کے یہاں چلے گئے۔ دو دن تک ان کے ساتھ مجلس کی، لیکن اس مجلس سے ان کی نہ تو تشنگی دور ہوئی اور نہ ہی فائدہ محسوس فائدہ ہوا۔ ان بزرگ نے اعتراف کیا کہ ہمارے مقابلہ میں آپ کی پرواز بلند ہے۔

یہ عاجز چار پانچ سال پہلے جب اسلام آباد جاکر حضرت مولانا عبدالحی صاحب

(مانسہرہ والے) سے استفادہ کرکے آیا اور انہیں اس کی تفصیل بتائی تو موصوف حاجی محمد انیس صاحب کو لے کر اسلام آباد گئے اور واہ کینٹ میں مولانا احسان الحق الحسینی صاحب کی خانقاہ میں مولانا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالحی صاحب کی طرف سے انہیں خلافت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

حضرت نثار احمد صاحب کو زندگی بھر ایک بڑی سعادت جو حاصل رہی، وہ پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت تھی۔ حالانکہ ان کے گھر سے مسجد تک کافی فاصلہ تھا۔ اس سے انہیں اضافی فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کی صحت بہت اچھی رہی۔

موصوف کھانے کے بہت شوقین تھے۔ کھانے میں پرہیز نہیں تھا، مجھ جیسے پیٹ کے مستقل مریض پر افسوس کا اظہار کرتے کہ جب تمہیں کھانے میں اتنی شدید پرہیز ہے تو پھر تم کام کیسے کرتے ہو۔

موصوف کی تصنیفی خدمات قابل قدر ہیں اور دوسرے بزرگوں کے لئے قابل تقلید بھی۔ کاش تصوف سے وابستہ بزرگ اور ان کے خلیفہ جدید دور کے تقاضوں اور نوجوان نسل کی علمی وذہنی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر تحریری کام کی طرف بھی توجہ مبذول کریں۔

حضرت نثار احمد صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ہر وقت دستیاب ہوتے تھے، جو بھی شخص جس وقت بھی چلا جائے، وہ ملتے تھے اور خوشی محسوس کرتے تھے۔

ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ مروجہ پیروں کی طرح سادگی چھوڑ کر، اپنا معیار زندگی بلند کرنے اور اچھی گاڑی اور بہتر بنگلہ وغیرہ کی فکر سے آزاد تھے۔ ایک سرکاری ادارہ میں سروس اختیار کی، ریٹائرمنٹ کے بعد ماہانہ سرکاری وظیفہ پر گذارہ کرتے رہے۔ حالانکہ اگر وہ معیار زندگی بلند کرنے اور مریدوں کے گھیراؤ میں رہنے کی کوشش کرتے تو وہ آسانی سے ایسا کر سکتے تھے۔

حضرت نثار احمد صاحب کی دو کتابیں ''پاکستان میں مغربی ثقافت وملحدانہ افکار کا نفوذ اور اس کے اسباب'' اور ''مغرب زدہ مسلمانوں کے نام'' جدید دور کے علمی وتہذیبی چیلنج کے فہم کے اعتبار سے بہت اہم نوعیت کی کتابیں ہیں۔ ان میں سے آخری کتاب

''بیداری'' میں قسط وار چھپ چکی ہے۔

البتہ تصوف کے موضوع پر ان کی کتابوں ''آئینہ سلوک'' و ''دشت سلوک'' میں معلومات اور مواد تو بہت زیادہ ہے اور بزرگان دین کے واقعات بھی زیادہ ہیں، لیکن ان میں جدید دور کے عقلیت کے شکار اور جدید اسلامی فکر کے حامل افراد کی ذہنی سطح کے مطابق ان کے لئے معلومات کا فقدان ہے، موجودہ دور میں عالمی مادی فکر اور مادی تہذیب کے غلبہ کے زیر اثر افراد کا جو فکری سانچہ بنا ہے، اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تصوف کی فنی چیزوں، تصوف کے علم کلام اور کشف، مشاہدوں، تصرفات اور توجہ وغیرہ کی بحث سے صرف نظر کیا جائے۔ یہ چیزیں ویسے بھی تصوف میں بنیادی حیثیت کی حامل نہیں۔

موصوف کی ''وہابیت کی تہمت'' کے نام سے بھی ایک کتاب ہے، جو اپنے موضوع پر منفرد نوعیت کی کتاب ہے، اس کتاب میں دیوبندی مکتبہ فکر کے ممتاز بزرگوں کی تحریروں کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہابیت کی کوئی بات بھی دیوبندی مکتبہ فکر کے بزرگوں اور فضلاء میں موجود نہیں، اس کے باوجود حیرت کی بات ہے کہ وہابیت کا یہ الزام ان پر کیوں چسپاں کیا گیا، دیوبندیوں کو بزرگان دین، سلف صالحین، ان کے علوم اور روحانی فیوض وبرکات کا مخالف ثابت کرکے، ان پر فتوے صادر کرنا اور ان کے دین ومذہب کو مشکوک سمجھنا، یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، زیر نظر کتاب میں فتحی صاحب نے اس غلط فہمی کو بہت بہتر طور پر دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی ایک کتاب ''قادیانیت'' کے موضوع پر بھی ہے، جو اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس میں قادیانیت سے وابستہ افراد سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کرکے، ان کے ضمیر کو بیدار کرنے اور انہیں علمی طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ ان کے ایک عزیز قادیانی ہوگئے تھے، ان سے ان کی گفتگو ہوتی رہتی تھی، جس سے انہیں اندازہ ہوا کہ وہ غلط فہمی اور معلومات کی کمی کی وجہ سے قادیانیت کا شکار ہوگئے ہیں، اور معاشرے میں ایسے بہت سارے لوگ ہوں گے، اس لئے ایسے لوگ فتویٰ سے زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔ دوستانہ ماحول

میں لکھی گئی یہ کتاب ایسے لوگوں کو حقیقت تک رسائی میں مدد دے سکتی ہے۔

فتحی صاحب نے بریلویت اور دیوبندیت کے اختلافات اور ان دونوں کے تصوف کی نوعیت کے موضوع پر کافی وسیع مطالعہ کیا تھا، اس مطالعہ کی بنا پر ان کی رائے تھی کہ ان دونوں کے درمیاں بنیادی چیزوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایک بار بتایا تھا کہ اس تحقیق کے دوران ایک بار خواب میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی زیارت ہوئی، میں نے ان سے یہی سوال کیا، انہوں نے اپنا منہ میرے کان کی طرف کرتے ہوئے فرمایا، کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف حکمت عملی کا ہے کہ ہم عام لوگوں کی لاعلمی کی وجہ سے انہیں شرک اور بدعات سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاں کچھ سختی ہے، جب کہ ان کے علماء کرام کے ہاں اس سلسلہ میں احتیاط نہیں، جس کی وجہ سے عوام میں گمراہی پھیل رہی ہے۔

حضرت نثار احمد صاحب کے ہاں قیام کے دوران ان کے فرزند کو نماز کے لئے مسجد میں کبھی نہیں دیکھا، ایک بار اس کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ اللہ اللہ کرنے والوں کی اولاد عام طور پر بہت سارے حجابات میں مبتلا ہوجاتی ہے، ان کی اصلاح بہت مشکل ہوتی ہے۔ مجھے اپنے لڑکوں کی اصلاح کی بہت فکر تھی، بڑے بیٹے کو میں نے بڑے اہتمام سے تبلیغ جماعت میں چلے پر بھی بھیجا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

حضرت نثار احمد صاحب کو تصوف میں صاحب کشف افراد سے ملنے اور ان سے اپنے حالات معلوم کرنے کی بڑی فکر رہتی تھی، ہمارے ایک جاننے والے متوسط صوفی کو کافی کشف ہوتا ہے، مولانا نے انہیں لکھا کہ وہ اپنے کشف کی نظر سے دیکھیں کہ میں کس مقام پر فائز ہوں، اس خط کی نقل موصوف نے ان متوسط صوفی کے شیخ کو بھی ارسال کی۔ حضرت شیخ صاحب نے فرمایا کہ طالب صادق کا اس سے بہتر کوئی مقام نہیں ہے کہ اسے اللہ اللہ کرنے کی مستقل سعادت عطا فرمائی گئی ہے۔

ایک بار حضرت نثار احمد صاحب نے یہ قصہ بتایا تھا، جو انہوں نے اپنی کسی کتاب میں بھی شامل کیا ہے کہ ان کی نوعمری کے دور کے ایک ساتھی پاک فضائیہ میں شامل ہوگئے تھے، وہ فضائیہ میں بڑے افسر کے درجہ تک پہنچ چکے تھے۔ انہیں روحانیت کی طلب پیدا ہوئی، انہیں ایک رات کو خواب میں ایک درویش نظر آئے، درویش نے

پوچھا کہ کیا درویش بنو گے، انہوں نے کہا کہ بڑی آرزو ہے کہ یہ سعادت حاصل ہو۔
درویش نے کہا کہ درویشی، فوجی وردی کی قیمت پر ہی حاصل ہوسکتی ہے، انہوں نے کہا کہ میں یہ قیمت دینے کے لئے تیار ہوں، خواب کی بات آئی گئی ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ایک مجلس میں روحانیت کا شوق ظاہر کیا تو ایک عامی شخص نے کہا کہ صاحب، آپ اگر میرے ساتھ میرے بزرگ کی زیارت کے لئے وقت نکال سکیں تو شاید آپ کی روحانی تشفی کی صورت پیدا ہوسکے،وہ فورا تیار ہوگئے، جب انہوں نے اس درویش کو دیکھا تو وہ صاحب انہیں وہی درویش نظر آئے، جسے وہ خواب میں دیکھ چکے تھے۔ درویش نے انہیں وہی بات کہی، جو خواب میں وہ سن چکے تھے۔ درویش سے ملاقات کے بعد انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا، اور درویش کی صحبت میں رہنے لگے۔ دنیا کی ساری سہولتوں سے دستکش ہو کر فقیرانہ لباس اختیار کیا اور جھگی میں رہنے لگے، ایک بار وہ میرے دفتر میں مجھ سے ملنے کے لئے فقیرانہ لباس میں آگئے۔ ان کے جانے کے بعد لوگ کہنے لگے کہ اب فقیروں نے بھی ہمارے دفتر کا رخ اختیار کر لیا ہے، کہنے لگے کہ اگر انہیں اس فقیر کا قصہ معلوم ہوتا تو سراپا حیرت ہوجاتے۔

اس درویش نے اپنے انتقال سے پہلے انہی کو اپنا خلیفہ نامزد کیا،لیکن انہوں نے جانشینی قبول نہیں کی اور جھگی میں رہ کر زندگی کے دن گذارے۔

حضرت نثار احمد صاحب نے متعدد بار تاکیداً فرمایا کہ تم اندرون سندھ کا سال میں ایک بار جو دورہ کرتے ہو اور متعدد شہروں میں تمہارے جو پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیلی رپورٹ ''بیداری'' میں شایع کیا کرو، تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہوکہ سندھ میں لادین قوتوں کے ساتھ ساتھ اسلام کے نظریاتی اور روحانی محاذ پر بھی کام ہورہا ہے۔ ان کے فرمانے پر''بیداری'' اردو اور سندھی کے دو تین شماروں میں اندرون سندھ کے دورہ اور تقریبات کی تفصیلی رپورٹ شایع ہوئی، لیکن دل کا فتویٰ یہ تھا کہ اپنے رسالہ میں اپنی ہی کارکردگی کی یہ تفصیل ریا اور خودنمائی کے ضمن میں شمار ہوسکتی ہے۔ بظاہر تو اشاعت دین کی تعارفی کارکردگی ہے،لیکن بباطن خودنمائی کی ایک صورت ہے۔ دل کے اس فتویٰ کے بعد''بیداری'' میں اس طرح کی رپورٹوں کی اشاعت سے

پرہیز اختیار کی۔

اسی طرح حضرت نثار احمد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ جو افراد پانچ چھ سال سے تمہاری سرکردگی میں سلوک میں چل رہے ہیں۔ انہیں اجازت دیدیا کرو، تاکہ اسلام کے باطنی محاذ کا کام مؤثر طور پر ہو سکے۔ اس پر راقم الحروف نے انہیں ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں یہ عرض کیا کہ یہ عاجز راہ سلوک میں ۲۵ سال سے چل رہا ہے، اب تک نفس قابو میں نہیں آرہا ہے۔۲۲ سال تک تو نفس کی سرکشی کی یہ حالت تھی کہ شب وروز اس سے خطرات لاحق تھے اور اس کی سخت چوکسی کرنی پڑتی تھی۔ اس عاجز کی نظر میں طالبوں کو غیرمعمولی مجاہدوں کے بغیر ''اجازت دینے'' کا مطلب انہیں شدید آزمائش میں ڈالنا اور روحانیت کے نام پر حب جاہ وحب مال کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ موصوف نے اس عاجز کے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

حضرت نثار احمد خان جیسے بزرگوں کی معیت میں طالب جوں جوں روحانیت کے سفر میں آگے بڑھتا ہے، اور اسے معتقد بھی ملنا شروع ہوجاتے ہیں تو اس وقت نفس کے مکر وفریب بھی باریک سے باریک تر صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات متوسط صوفی کی یہ نفسیات بننا شروع ہوجاتی ہے کہ دوسروں کو اپنا تابع بنایا جائے اور ان پر اپنے حکم جاری کئے جائیں اور ان کی ذہنی آزادی کو سلب کیا جائے، روحانیت کا صاحب ہونے کی وجہ سے اپنے معتقدین پر ان کا یہ ایک ایسا حق ہے، جو انہیں راضی خوشی تسلیم کرنا چاہئے، اگر شروع سے اس نفسیاتی روگ کا علاج نہ کیا گیا تو روحانیت میں ارتقا کے باوجود یہ نفسیات غالب ہونے لگتی ہے، اس کی وجہ سے جو بڑا نقصان ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سمجھدار معتقدین کے دلوں میں مانوسیت اور محبت میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ بلکہ ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔حضرت نثار احمد صاحب جیسے بزرگوں کی صحبت سے ہم جیسے طالبوں پر یہ نکتہ واضح ہوتا ہے، اس لئے بچت کی واحد صورت یہی ہے کہ طالب ہر صورت میں چھوٹا بن کر رہے، دوسروں پر حکم چلانے کی روش چھوڑ دے۔ زندگی بھر اپنی اصلاح کی فکر کو غالب کرے اور مسلسل خود احتسابی سے کام لیتا رہے، ورنہ وہ سخت خسارہ میں رہے گا۔

یہاں اپنی ان کوتاہیوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ان کے سلسلہ میں ہم سے

واقع ہوئیں۔ ایک یہ کہ ان کا کہنا تھا کہ ہماری کتابیں ملک بھر کے علمی رسالوں کو بھیج کر ان رسالوں میں کتابوں پر تبصرے کی کوشش کی جائے، اس سلسلہ میں رسالوں کے مدیروں کو خطوط بھی لکھے جائیں، تاکہ کتابوں کا صحیح طور پر تعارف ہو سکے اور قارئین کے سامنے کتابوں کی اہمیت اجاگر ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ ''بیداری'' میں بعض مضامین ان کی مرضی کے مطابق شایع نہ ہو سکے، اپنی ان کوتاہیوں پر اب معذرت کی بھی صورت باقی نہ رہی۔

قریبی بزرگوں اور دوستوں کے انتقال کے بعد طبیعت پر کافی دنوں تک یہ احساس غالب رہتا ہے کہ موت جو اتنی اٹل حقیقت ہے، اس کی تیاری تو کچھ بھی نہ ہو سکی ہے۔ زندگی تو غفلت ہی غفلت میں ضایع ہوئی۔ ان بزرگ کے بعد اب ہماری باری ہے اور موت اور ہمارے درمیاں اب فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس احساس کے غلبہ سے طبیعت میں اداسی ہونے لگتی ہے، لیکن معا بعد قرآن کی چند آیتیں سامنے آنے لگتی ہیں، جس سے حوصلہ اور امید کا پہلو غالب ہونے لگتا ہے۔

ان میں سے چند آیتیں اس طرح ہیں۔

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ.

(جو مومن ہیں اور جنہوں نے اپنے ایمان میں ظلم (یعنی شرک سے ملاوٹ نہ کی، یہی لوگ حالت امن میں ہوں گے)۔

وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِھِمْ .

(تمہارا رب لوگوں کو باوجود ان کے ظلم (یعنی گناہوں کے) کے معاف کرنے والا ہے۔)

(۲)

حضرت نثار احمد خان صاحب کے حوالے سے یہ بات بیان کرنا شاید افادیت کا حامل ہو کہ موصوف سے جب ہمارے تعلقات کافی بڑھے اور حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی صحبت کی باتیں اور ان کے واقعات سنتے رہے اور تصوف کے حوالے سے انہوں نے ہمارے علمی کام کو بھی دیکھا تو انہوں نے ہمارے ساتھ غیر معمولی حسن

ظن کا مظاہرہ فرمایا اور ہمیں چاروں سلسلوں میں اجازت کا خط ارسال کیا اور ٹیلیفوں کے ذریعہ اس کی اطلاع بھی دی۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

محترم جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ آپکی ارسال کردہ کتابیں موصول ہوئیں، جزاک اللہ احسن الجزا۔ ''بیداری'' بھی ملتا رہتا ہے، قابل مطالعہ مضامین سے پُر ہوتا ہے، یہ مدیر کے علمی وادبی اور تہذیبی ذوق کی بین دلیل ہے۔ گذشتہ دنوں جو آپ نے شاہ عبداللطیف بھٹائی، قاضی قادن، شاہ عبدالکریم بلڑی والے، خواجہ محمد زمان لواری والے اور مولانا رومی کے صوفیانہ اشعار کی تشریحات کی ہیں اور جس خوبصورتی سے ان کے ادق کلام کے مفہوم کو اردو کے آسان قالب میں ڈھالا ہے اور جس خوبی سے تصوف کی اصطلاحات، مقامات، کیفیات وواردات کی تشریح کی ہے اور جس انداز سے عاشقانِ الٰہی پر گذرنے والی قیامتوں اور ٹوٹنے والے پہاڑوں کا تذکرہ کیا ہے، میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپکی اس خدمت کو دادِ تحسین دے سکوں۔

آپ نے تصوف پر جہاں جہاں اور جو کچھ لکھا ہے اور عشق کے بارے جس طرح خامہ فرسائی کی ہے، وہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ غیر بیتی نہیں، آپ بیتی ہے۔ شنید نہیں، دید ہے۔ الحمد اللہ، راہ سلوک کے نشیب وفراز سے آپ بخوبی گذر چکے ہیں اور میری نظر میں اب آپ اس مقام پر ہیں کہ دوسروں کو بھی خدا کا راستہ دکھا سکتے ہیں، اسلئے اپنے قلب کے تقاضے کے مطابق بنامِ خدا جو نعمت میرے شیخ حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ نے مجھے عطا کی تھی، وہ آپکے سپرد کرتا ہوں۔ آپ کو چاروں سلسلے میں بیعت لینے کی اجازت ہے، تعلیم کسی ایک سلسلے کے طالب کے شوق اور استعداد کو دیکھ کر دیں۔ میں ناکارہ اپنے شیخ سے شرمندہ ہوں کہ کچھ بھی نہ کر سکا، مگر امید ہے کہ حق تعالیٰ آپ کے ذریعہ سلسلے کو فروغ بخشے گا۔ برکت کے لئے اپنے شیخ کی اجازت کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ میرے لئے حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں، بالکل آخری وقت ہے، طویل سفر درپیش ہے اور زاد راہ بجز اسکے فضل وکرم اور حسن ظن کے کچھ بھی نہیں۔

والسلام

نثار احمد خان فتحی

۲۶ اگست ۲۰۰۹ء

ہم نے عرض کیا کہ اگرچہ ہمیں حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے دوخلفاء حضرت حکیم محمد رفیق صاحب اور حضرت سلیم صاحب کی طرف سے حسن ظن کی بنا پر اجازت ہے، لیکن یہ عاجز اس عظیم کام کا کسی طور پر بھی اہل نہیں ہے، اس لئے کہ اب تک نفس کے مکر وفریب کے ایسے مشاہدے ہوتے رہے ہیں کہ نفس کی اس حالت کے ساتھ یہ کام ہاتھ میں لینا، اپنے آپ کو سخت خطرات میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

تصوف پر کتابیں لکھنا یا بزرگوں کے کلام کی تشریح کرنا، یہ تو علم، ذہانت اور مطالعہ کی بنا پر بھی ہوسکتا ہے، لیکن نفسی قوتوں کی سرکشی کے زور کو توڑ کر، حالت فنا سے حالت بقا میں آنا، یہ خوش نصیب افراد ہی کا حصہ ہوتا ہے، یہ عاجز اس اعتبار سے اپنے آپ کو ناقص شمار کرتا ہے، یہ عاجزی نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ سمندر نفس اتنا گہرا ہے کہ اس کی گہرائیوں میں جاکر جواہر وموتی لانا، ہماری جیسی استعداد کے حامل افراد کا حصہ ہو، دشوار ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ ایسا ہی ہوتا ہے، اللہ کو جس سے کام لینا ہوتا ہے، اس میں اپنی نااہلیت کا احساس غالب کردیتا ہے، بہرحال اس عاجز نے ان بزرگوں کی طرف سے اجازت کے باوجود بیعت کے بغیر دوستی کی بنیاد پر اپنی اصلاح اور دوستوں کی اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ بعد میں مانسہرہ کے حضرت مولانا عبدالحی صاحب مدظلہ کی طرف سے بھی حسن ظن کی بنا پر اجازت فرمائی گئی۔

یقیناً اہل اللہ کا حسن ظن خود بڑی سعادت کی بات ہے، ان کے دل کا غالب میلان عنداللہ کے مترادف ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات اہل اللہ پر معاملہ کا ایک پہلو غالب ہوتا ہے، دوسرے پہلو پر ان کی نگاہ کم ہوتی ہے۔ مثلا معاشرہ میں دعوتی کام اور افراد کی اصلاح کے کام پر ان کی نگاہ زیادہ ہوتی ہے کہ فرد کو اجازت دے کر ان کے ذریعہ سے معاشرہ میں فروغ دین کا کام ہو، لیکن جو فرد راہ سلوک کے سارے مدوجزر سے نہ گزرا ہو، وہ جب کام کرنے لگتا ہے تو حب جاہ وحب مال کے دبے ہوئے جذبات ابھر کر آنے لگتے ہیں، اس طرح طالب خطرات کی زد میں آنے لگتا ہے۔

بہرحال اسی طرح کام چلتا رہا اور حضرت نثار احمد خان صاحب کے ہاں

آمدورفت ہوتی رہی، اسی دوران حضرت نثار احمد خان صاحب پر پھیپھڑوں میں پانی بھرنے کی بیماری حملے ہوتے رہے۔ علاج معالجہ کے بعد وہ صحت یاب ہوتے رہے۔ صحت کے بعد ایک تو ان کے علمی کام میں اضافہ ہوتا رہا، دو تین ماہ کے اندر اندر ان کی طرف سے ایک کتاب تیار ہوتی رہی، دوم یہ کہ مزاج میں تیزی اور سختی میں اضافہ ہوگیا۔ متعدد بار فرمایا کہ پھیپھڑوں میں پانی بھرنے کی تکلیف ایسی شدید ہوتی ہے کہ فرد اپنے آپ کو تختہ دار پر لٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

اس بیماری کی وجہ سے ان کے مزاج کی حساسیت میں اضافہ ہوتا رہا، اس بیماری اور حساسیت کی وجہ سے بعض معاملات پر ان کی رائے کو قبول کرنے میں ہمیں دشواری محسوس ہوئی، چنانچہ ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہمیں خلافت کی ذمہ داری سے سبکدوش فرمائیں، آخری دور میں ان سے ہمارے رابطہ میں کمی آئی، تاہم ان کی طرف سے خطوط بھی آتے رہے اور کبھی کبھار اپنے خادم ناصر صاحب کی معرفت گفتگو بھی فرماتے رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سے ان کے حق میں جو کوتاہیاں واقع ہوئیں، وہ ہمیں معاف فرمائیں۔ **(ماخوذ ''بیداری'' ستمبر۲۰۱۴ء)**

مولانا محمد سلیمان طاھر

(۱)

مولانا محمد طاھر صاحب لگ بھگ ۷۸ سال کی عمر میں ۱۷ اگست کو کراچی میں انتقال کر گئے، **اناللہ وانا الیہ راجعون.**

موصوف کا شمار سندھ کے ان غیرمعمولی ذہین علماء میں ہوتا ہے، جو خدا داد اور فطری صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ کے عزیز اور ان کے مرید تھے، لیکن بعد میں مولانا مودودی کی فکر سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان سے ان کا تعلق منقطع ہوگیا۔

انہوں نے ابتدائی دور میں حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ کی ملفوظات بھی مرتب کئے تھے، جو تین حصوں (جلدوں) میں چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

مولانا محمد سلیمان طاھر صاحب سے میرے تعلقات کی کہانی پچھلے پچاس سالہ دور کی کہانی ہے، ۱۹۶۵ء میں جب کہ میری عمر ۱۴ سال کے لگ بھگ تھی، وہ جماعت اسلامی ضلع سکھر کے امیر کی حیثیت سے ہمارے گاؤں جندو دیرو دورہ پر آئے، میں انہیں اسٹیشن پر لینے کے لئے گیا، چونکہ ہمارا پورا خاندان جماعت اسلامی سے وابستہ تھا، اور سندھ میں جماعت اسلامی کو متعارف کرانے اور گاؤں گاؤں اس کی دعوت کو پھیلانے میں ہمارے عزیز مولانا جان محمد بھٹو صاحب کا کردار اہم اور بنیادی تھا، مولانا جان محمد صاحب کی پاکیزہ عملی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی، موجودہ دور میں ان جیسے ولی صفت انسان نظر نہیں آتے۔

پچاس سالہ دور میں مولانا محمد سلیمان طاھر صاحب سے تعلقات میں تھوڑے بہت مدوجزر تو آئے، لیکن تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں ہوئے۔ جب ان کی سرپرستی میں ۱۹۸۵ء میں کراچی میں مسلم انسٹیٹیوٹ کے تعاون سے اسلامی انقلاب کے کام کے

لئے مرکز قائم ہوا اور ''الفجر'' کے نام سے ماہنامہ رسالہ کا اجراء ہوا تو اس دور میں میرا کراچی آنا جانا بہت زیادہ تھا۔ اور میں زیادہ تر انہی کے ہاں قیام کرتا تھا، میرا موضوع گفتگو اکثر تصوف رہتا تھا۔ چونکہ موصوف ایک زمانہ میں سندھ کے ولیٔ کامل حضرت مولانا حمادالله ھالیجویؒ کی صحبتوں سے متمتع ہو چکے تھے، اس لئے میری باتیں ان کے دل کو اپیل کرتی تھیں، تاہم عملی طور پر ان پر اقامت دین اور انقلاب اسلامی کا رنگ غالب تھا اور وہ ذہنی طور پر تصوف کو اس راہ میں حائل سمجھنے لگے تھے۔

مولانا محمد سلیمان طاھر صاحب کی عملی زندگی کا سفر ایسا ہے، جو مشکلات سے بھرا ہوا ہے۔ حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ سے تعلق ٹوٹ جانے کے بعد وہ طویل عرصہ تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے، جماعت اسلامی ضلع سکھر اور بعدازاں جماعت اسلامی ضلع حیدرآباد کے امیر رہے، ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی حکومت کے خلاف متحدہ جمہوری محاذ کے نام سے مختلف جماعتوں کا جو محاذ بنا تھا، موصوف اس کے سندھ کے سیکریٹری جنرل بھی رہے۔

اس کے بعد موصوف ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے قائم کردہ ''مسلم انسٹیٹیوٹ'' کے اسلامی انقلاب کے پروگرام کے علمبردار بنے اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے حالات سازگار کرنے اور اس کے لئے فکری وعملی طور پر کام کرنے کے لئے متعین ہوئے۔ اور برسوں تک اسی محاذ پر کام کرتے رہے۔ آخری چھ سات سال تک موصوف محترم نور احمد سندھی صاحب کے ادارہ ''حکمت قرآن'' سے وابستہ ہوئے، جس کے مقاصد میں سرمایہ داروں کے خلاف جہاد اسلامی کے نصب العینی کام کا حصہ ہے۔سرمایہ داروں کے خلاف جہاد واقعتہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے، اس لئے کہ سرمایہ دار، شقاوت قلبی کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے، جو حیوانیت کا بدترین مقام ہے، عالمی سرمایہ دار ہو یا مقامی سرمایہ دار، اس نے محض دولت کی خاطر کروڑوں اربوں انسانوں کے لئے زندگی اجیرن بنادی ہے اور ان سے روٹی کا ٹکرا تک چھین لیا ہے اور خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ لیکن سرمایہ دار، دراصل اس نفسیات نام ہے، جو حرص وہوس کے بتوں سے سجی ہوئی ہے۔ اس نفسیات کا حامل انسان چاہے کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو، لیکن جب وہ سیاست، تجارت اور مہارت کے ذریعہ دولتمند بن

جاتا ہے تو وہ قارون کی صورت اختیار کر جاتا ہے اس قارون انسان کی درستگی کی صورت کا پیدا ہونا، سارے کاموں سے پہلے ترجیحی کام ہے۔ جب اصلاح ہوجاتی ہے تو بڑے سے بڑا سرمایہ دار بھی اللہ کی مخلوق کو اس کا کنبہ تصور کرنے لگتا ہے اور اس کے لئے شفیق بن جاتا ہے۔

غالبا ۸۳ کی بات ہے کہ محمد بن قاسم ادبی سوسائٹی کے تعطل کے بعد ہم چند اہل علم نے سوچا کہ سندھی زبان میں ایسا علمی ادارہ قائم کیا جائے، جو اسلام کے نظریاتی محاذ پر جدید سندھی افراد کی بہتر اور مؤثر طور پر رہنمائی کر سکے، اس سلسلہ میں انور جوکھیو صاحب، شکیل احمد صاحب، مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب اور راقم الحروف نے مل کر ''سندھ نیشنل اکیڈمی'' کے نام سے ادارہ تشکیل دیا۔ لیکن ایک سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان ساتھیوں کے پاس عملی طور پر کام کے لئے وقت نہیں، البتہ وہ مشاورت کی حد تک معاونت کر سکیں گے۔

چنانچہ ان دوستوں کی عملی سرد مہری کی وجہ سے اس عاجز کو اس ادارہ کے لئے دوسرے متحرک افراد تلاش کرنی پڑی، دوڈھائی سال کے تجربات کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کام کے لئے مجھے خود ہی سارا کام کرنا پڑے گا اور کام شروع کرنے کے بعد اللہ کی طرف سے کام کی صورتیں نکلتی رہیں گی، الحمدللہ ایسا ہی ہوا۔

مولانا محمد سلیمان صاحب ہمت اور حوصلہ کی حامل شخصیت تھے، جماعتی اور تحریکی زندگی میں انہیں کام کرنے اور ابھرنے کے بڑے مواقع ملے، لیکن کچھ تو اپنی بعض کمزوریوں اور کچھ افراد کی حاسدانہ اور رقیبانہ جذبات کی وجہ سے وہ بڑی آزمائشوں کا شکار رہے۔ لیکن وہ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہوئے۔

اپنی غیرمعمولی ذہانت، تجزیاتی صلاحیت، بہتر منصوبہ بندی، تعلقات کو نبھانے کی استعداد جیسی خوبیوں کے معاملہ میں سندھ میں جماعت اسلامی میں مولانا جان محمد عباسی صاحب کے بعد انہی کی شخصیت تھی۔ لیکن موصوف جماعت میں قیادت کے مقام پر فائز ہوکر کام کرنے کی بجائے جماعت کی رکنیت تک سے دستکش ہوگئے۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے مسلم انسٹیٹیوٹ کے پاکستان میں کام کے ذمہ دار ہوئے اور اسلامی انقلاب کے لئے حالات سازگار بنانے کے کام پر متعین ہوئے اور اس کے

لئے انہیں دفتر اور وسائل بھی فراہم کردیئے گئے اور اس کام کے لئے انہوں نے اپنی صلاحیتوں وتوانائیوں کا آخری حد تک استعمال کیا، لیکن سات آٹھ سال کے دوران وہ دوبارہ آزمائش کا شکار ہوئے۔ بعد میں ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے انتقال کے بعد مسلم انسٹیٹیوٹ کا پاکستان میں سارا کام ہی ختم ہوگیا۔

تحریکی اور جماعتی زندگی میں اس عاجز نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جن نفسی خرابیوں کا مشاہدہ کیا، وہ ایسی خرابیاں ہیں کہ فرد و افراد کی بے پناہ خوبیوں وصلاحیتوں کے باوجود انہیں المیہ بنادیتی ہیں، مثلا جماعتی زندگی میں باصلاحیت فرد جب آگے بڑھنے لگتا ہے تو حسد اور جلن کی نفسیات کی وجہ سے مجھ جیسے افراد اسے گرانے کے لئے سازشوں کا جال بننے لگتے ہیں۔

اس طرح شعوری یا غیرشعوری طور پر اپنی حرکتوں سے جماعت کے ساتھ باصلاحیت افراد خود بھی شدید مشکلات کا شکار ہونے لگتے ہیں۔

تصوف واہل تصوف سے وابستگی سے پہلے جماعت اسلامی کے فکری دائرے میں رہتے ہوئے مزاج کے خلاف ہونے والی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمارے احساسات بڑے شدید ہوجاتے تھے، اس کا اندازہ کچھ واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۵ء میں لاہور سے نکلنے والے رسالہ ہفتہ روزہ ''افریشیا''جس کے مدیر عبدالکریم عابد صاحب اور سرپرست عبدالقادر حسن تھے، اس میں سندھ میں پس ماندگی میں سندھ کے وڈیروں کے کردار کے موضوع پر میرا دوقسطوں پر مشتمل مضمون شائع ہوا، جس میں میں نے تفصیل سے لکھا تھا کہ سندھ کی سیاسی قیادت وڈیروں کے ہاتھ میں ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر نہیں چاہتے کہ سندھ میں تعلیم عام ہو اور آزاد سوچ کو فروغ حاصل ہو، کچھ ہفتوں کے بعد میرے اس مضمون کے خلاف اور وڈیروں کے حق میں ''افریشیا'' میں ہی ایک مضمون شائع ہوا۔

یہ مضمون قمر شیخ کے نام سے شائع ہوا، جو مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کے گہرے دوست تھے، میں نے متعدد بار بالواسطہ طور پر مولانا سلیمان صاحب کے سامنے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا کہ اب جماعت اسلامی کی طرف سے وڈیروں کی وکالت کا کردار ادا کیا جارہا ہے اور یہ مضمون آپ ہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مولوی

صاحب خاموش رہے، لیکن آخر میں انہوں نے اس مضمون کا اصل متن دکھایا، جو سندھ کی جماعت اسلامی کی سب سے ذمہ دار شخصیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا کہ موصوف نے انہیں دیا تھا کہ وہ اسے نقل کرکے رسالہ کو اشاعت کے لئے بھیجیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں ۱۹۷۰ء کے آخر سے میرے مضامین شایع ہونے لگے، اخبار کے ایڈیٹر عبدالکریم عابد صاحب نے میرے مضامین کے ساتھ وقائع نگار خصوصی برائے سندھ کا لاحقہ بھی لگانا شروع کیا، جب اس حیثیت سے میرے کئی مضامین شایع ہوئے اور بہت پسند کئے جانے لگے تو میں نے جماعت اسلامی سندھ کی ذمہ دار شخصیت سے عرض کی کہ وہ ''جسارت'' کے مدیر کو فون کرکے کہیں کہ اب ان کا ''جسارت'' میں باقائدہ تقرر کریں، موصوف نے ایسا کرنے سے معذرت ظاہر کردی۔

یہ دونوں واقعات بظاہر ایسے تھے، جو زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے، اس لئے کہ موصوف کو مجھ سے اور میری رائے سے اختلاف کا پورا حق حاصل تھا، وہ پورے اخلاص کے ساتھ ایسا کرنے کا حق رکھتے تھے، لیکن روحانیت اور تزکیہ کی غیر معمولی کمی کی وجہ سے اس طرح کے واقعات جماعت اسلامی کی قیادت سے دوری کا ذریعہ بنتے گئے۔ لیکن جب اہل تصوف سے میرا تعلق قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ تو مریضانہ نفسیات تھی، جس میں میں مبتلا تھا۔

اب بعد کے دواقعات سنئے۔ ہم نے ۱۹۸۴ء سے سندھی زبان میں لادینیت کے خلاف نظریاتی لٹریچر کا کام شروع کیا۔ یہ باقائدہ کام تصوف سے وابستگی کے بعد شروع ہوا۔ جماعت اسلامی سے فکری تعلق رکھنے والی کراچی کی ایک شخصیت نے ہم سے ہر ماہ پانچ سو کتابیں لے کر سندھ بھر کے علمی حلقوں کو بھیجنا شروع کردیں، جب اس کا علم جماعت اسلامی سندھ کی ذمہ دار شخصیت کو ہوا تو موصوف نے انہیں میرے ساتھ تعاون سے سختی سے روک دیا۔ جس کا مجھے علم ہوا، اب الحمدللہ موصوف کی اس بات کا میری صحت پر کوئی اثر نہیں ہوا اور متعلقہ شخصیت نے مجھے کہدیا کہ سندھ میں بنیادی مسئلہ کسی جماعت کے تحفظ وفروغ کا مسئلہ نہیں، بلکہ نئی نسل کو لادینیت سے بچانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ آپ کام کریں، ہمارا تعاون آپ کے ساتھ جاری رہے گا۔

۱۹۷۵ء میں ''سندھ میں بے چینی کے اسباب'' کے نام سے سندھی زبان میں ہماری کتاب شایع ہوئی، جس میں سندھ میں قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا تفصیل سے جائزہ لے کر اصلاح احوال کی صورت پیش کی گئی تھی، اس کتاب کو جماعت اسلامی سندھ کی ایک ذمہ دار شخصیت نے جماعتی نقطہ نگاہ سے نقصان دہ سمجھتے ہوئے، اس پر پابندی عائد کی اور مجھے اس کتاب کو مارکیٹ میں لانے سے منع کر دیا۔ بعد میں میں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کرکے اسے ''باب الاسلام سندھ حالات ومسائل کا جائزہ'' کے نام سے شائع کیا، جس کے بعد میں ''سندھ کے حالات کی سچی تصویر'' کے نام سے کئی ایڈیشن شایع ہوئے۔

جماعت اسلامی کے امیر کی حیثیت سے ان کا یہ ایک بنیادی حق تھا کہ وہ جس چیز کو جماعت کے لئے مضر سمجھیں، رکن جماعت کو اس کام کا حکم صادر فرمائیں، لیکن اصلاح نفس کے غیر معمولی فقدان کی وجہ سے ان کے اس حکم نے مجھے شدید احساسات کا شکار بنادیا۔

ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے، اس زمانہ میں روزنامہ ''جنگ'' میں میرے مضامین چھپتے تھے، میں نے اس میں ''اسلام کی نشاہ ثانیہ کیسے ہو'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں میں نے لکھا کہ تصوف واہل تصوف سے استفادہ کئے بغیر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کام ہو سکے، سلف صالحین کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا ہونا دشوار تر ہے۔ اس لئے کہ محض فکر میں یہ طاقت نہیں موجود ہے کہ افراد کے نفسوں میں تغیر پیدا کرکے، انہیں اوصاف حمیدہ کا حامل بنا سکے۔

میرے اس مضمون کو پڑھکر جماعت اسلامی سندھ کے اس وقت کے سب سے بڑے دانشور سخت نالاں ہوئے اور موصوف نے میرے خلاف جماعت کے رسالہ ''وینجھار'' میں کئی قسطوں پر مشتمل مضمون لکھا۔ جس میں موصوف نے لکھا کہ یہ وہ سانپ ہے کہ جو اسے پالتا ہے، اسی کو ڈستا ہے۔ وغیرہ وغیرہ، موصوف کے ہر مضمون کے بعد ''وینجھار'' کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوتی اور میں انہیں ہنس کر کہتا کہ یہ سب آپ کی غلط فہمی ہے۔ میری تو صرف یہ آرزو ہے کہ اشاعت دین اور غلبہ دین کے کام میں سلف صالحین کے تسلسل کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور اقامت دین کے کارکن

خود قلبی سکون کی نعمت سے بہرہ ور ہوں۔

تصوف سے وابستگی سے پہلے اور تصوف سے وابستگی کے بعد احساسات کا یہ فرق تھا، جو بالکل واضح تھا۔ پہلے فرد کی حیثیت ایک نفسیاتی مریض کی سی تھی۔ بعد میں فرد کی حیثیت حقیقی داعی کی سی ہوگئی، جو بڑی حد تک نفسیاتی احساسات سے بلند ہوگیا۔

یہ وہ نکتہ تھا، جو یہ عاجز برسوں تک مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کے گوش گذار کرتا رہا کہ کسی اہل اللہ کی صحبت کے بغیر باطنی فسادات سے بچ کر صالح اسلامی تحریک کے فروغ کا کام ہونا، یہ آرزو تو ہوسکتی ہے، لیکن عملا ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

مولانا موصوف اگر ایسا کرتے تو ان کی غیر معمول ذہانت سے سندھ میں اسلامی تحریک طاقتور ہوتی، اور وہ خود جن بحرانوں سے گذرتے رہے، ان سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوجاتی۔

تزکیہ نفس کے لئے مجاہدوں کے عمل سے گذرے بغیر اقامت دین اور انقلاب اسلامی کا کام کس طرح متاثر ہوتا ہے اور اس میں کس طرح انتشار برپا ہوتا ہے، اس کا اندازہ مسلم انسٹیٹیوٹ کے کام اور اس کی ٹوٹ پھوٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب نے لندن میں مذکورہ ادارہ قائم کیا تھا۔ ایرانی انقلاب کے بعد موصوف نے مسلم ممالک میں اسی طرح کے انقلاب کے لئے سرگرمیاں شروع کیں۔ کتابیں لکھیں اور ہر سال لندن میں بین الاقوامی سیمیناروں کا سلسلہ شروع کیا۔ پاکستان میں مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کی نگرانی میں یہ کام شروع ہوا، کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اسلام کے لئے جذبہ رکھنے والے ذہین افراد سے رابطے ہوئے۔ پانچ چھ سال کی جدوجہد کے بعد مسلم انسٹیٹیوٹ کراچی کے مرکز میں داخلی انتشار پیدا ہوا۔

عبدالخالق شیخ صاحب جو اس کام میں مولانا موصوف کے دست راست تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ اب کی بار ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کراچی آرہے ہیں۔ میں تفصیل کے ساتھ مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کی شکایات ان کے سامنے پیش کروں گا۔ چونکہ عبدالخالق شیخ صاحب میرے زیر تربیت بھی رہے تھے اور غیر معمولی ذہین نوجوان تھے (اب ایک اچھی سروس میں ہیں) میں نے انہیں سختی سے لکھا ایسا کہ ہرگز

نہ کرنا، ورنہ ادارہ زیروزبر ہوجائے گا۔ وہ نوجوانی کے جوش میں تھے اور باہمی اختلافات کی وجہ سے غصہ میں تھے، انہوں نے ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے سامنے شکایات کی طول طویل داستان پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب پانچ سات سال تک کے مولانا موصوف کے کام سے زیادہ مطمئن نہیں تھے، انہوں نے عبدالخالق شیخ سے غیر معمولی توقعات وابستہ کرلیں اور فیصلہ کیا کہ مولانا صاحب عبدالخالق صاحب کی نگرانی میں کام کریں گے۔

اس طرح سال ڈیڑھ کے اندر ہی ادارہ کی حیثیت ختم ہوگئی۔

بعد میں فیصلہ ہوا کہ اسلامی انقلاب کا یہ کام صاحبزادہ خورشید گیلانی صاحب کی سربراہی میں لاہور سے شروع ہو اور مولانا سلیمان صاحب ان کے معاون بن کر کام کریں۔ چنانچہ لاہور میں مرکز قائم کیا گیا اور مولانا سلیمان صاحب نے ان کے معاون کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ لیکن دوتین سال کے اندر اندر یہ کام بھی انتشار کی نذر ہوگیا۔

ان سارے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب پر زور دیا کہ وہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ؒ سے بیعت ہوکر روحانی توانائی کے حصول کے لئے کوشاں ہوں، تاکہ جماعتی زندگی میں اس طرح کے بحرانوں سے بچنے کی صورت پیدا ہو۔ موصوف حضرت ڈاکٹر صاحب سے بیعت بھی ہوگئے اور ان کی متعدد نشستوں میں بھی شریک ہوئے، لیکن اس سلسلہ میں ان سے استقامت کا مظاہرہ نہ ہو سکا۔

سندھ میں ہمارے سارے حلقہ میں ان سے زیادہ ذہین فرد ہمیں کوئی نظر نہیں آیا۔ ہر اہم معاملہ میں تجاویز ومشوروں کا وہ ایسا خاکہ پیش کرتے تھے کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔

موصوف مختلف اوقات میں جن رسالوں کے ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر رہے، ان میں ''الفجر''، ''نئیں سوچ'' ''الولی'' ''آباد گار'' ''الحماد'' ''الاقتصاد'' اور ''توحید'' وغیرہ شامل ہیں۔ آخر میں حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کے شعبہ تعلیمات کے انچارج رہے۔

موصوف میں مخالفوں کو معاف کرنے، سب کے ساتھ تعلقات مستحکم کرنے، دوستوں سے نبھانے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی صلاحیت بھی بے پناہ

تھی۔

محترم نور محمد سندھی صاحب کے ادارہ سے وابستہ ہونے کے بعد اگرچہ ان سے ہمارے گہرے تعلقات متاثر ہوئے، تاہم وہ تعلقات ختم نہیں ہوئے۔ انتقال سے دوچار ماہ پہلے موصوف حیدرآباد آئے تو ان سے دو تفصیلی نشستیں ہوئیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ہم جیسے لوگوں کی اصلاح فرمائے، جو ایسے ذہین افراد کو آگے بڑھتا ہوا دیکھکر انہیں گرانے کی کوششوں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب، عمر بھر دین وملت اور غلبہ دین کے کاموں میں مصروف رہے، دنیا کمانے کے لئے فکر نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ساری عمر مالی اعتبار سے تہی دستی کی حالت میں گذاری، موصوف بظاہر اس طرح رہتے تھے، گویا وہ خوشحال شخصیت ہیں۔ لیکن زندگی بھر کرایے کے مکان میں رہے۔ بسوں میں سفر کرتے رہے، آخری عمر میں ان کی حالت یہ تھی کہ علاج معالجہ کے لئے رقم نہیں تھی، جیب خالی تھا۔ ان کا دوستوں اور ساتھیوں کا بڑا حلقہ تھا، ایسے افراد، جن کی انہوں نے ایک دور میں ذہنی وفکری تربیت کی تھی، وہ بھی کافی تعداد میں تھے۔ اور وہ مالی اعتبار سے خوشحال تھے، لیکن اس سارے عرصہ میں ان میں سے کسی نے بھی ان کی مالی معاونت نہیں کی۔ بس ڈاکٹر نیاز عامر صاحب نے تھوڑی بہت معاونت کی، اور آخر میں علاج کے لئے انہوں نے کچھ رقم دی۔

جس معاشرہ میں ملت کا کام کرنے والے افراد کی پرسان حالی کی یہ صورت ہو، وہ معاشرہ پنپ سکے، بحرانوں سے بچ سکے، کیسے ممکن ہے۔ اللہ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔

مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کی شخصیت پر ہم نے اپنی کتاب ''جدید سندھ کے علماء ودانشور خطوط اور خاکے'' میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اگست ۲۰۰۰ء میں شایع ہوئی ہے۔ یہ خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس خاکہ کے ساتھ موصوف کا میرے نام ایک تفصیلی خط بھی ہے جو دیا جارہا ہے۔

(۲)

مولانا محمد طاہر سلیمان صاحب کے ساتھ دوسری شخصیت جن سے میں نے اپنی ابتدائی صحافتی زندگی میں سیکھا اور حاصل کیا، وہ قربان علی بگٹی صاحب کی شخصیت تھی۔ بگٹی صاحب بہت بڑے دانشور تھے، ان کا مطالعہ ہمہ جہتی اور غیرمعمولی طور پر وسیع تھا، مطالعہ کے ساتھ حافظہ بھی ایسا قوی تھا کہ کمپیوٹر کی طرح کہ اس میں ایک بار جو مواد ڈالا جائے، وہ محفوظ ہوجاتا ہے۔ ابتدائی دور تھا، ان دونوں شخصیتوں کی ذہانت اور تجزیہ کی صلاحیتوں سے اس عاجز نے خوب استفادہ کیا، لیکن ۱۹۸۴ء میں جب ایک بزرگ کی صحبت حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ عقل کی پرواز مادی دنیا کی معلومات اور قیل قال سے آگے نہیں ہوتی۔ حقیقت تک رسائی کے بعد قیل وقال اور تجزیے قابل ذکر اہمیت کے حامل نہیں ہوتے، اس کے بعد باطنی بصیرت کی جو استعداد پیدا ہوتی ہے، وہ مطالعہ اور تحریری صلاحیت کے ساتھ مل کر فرد کو معاشرہ کا نبض شناس بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ان دونوں سے دوستانہ مراسم تو برابر جاری رہے، لیکن یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ان دونوں کو اہل تصوف سے استفادہ کی دعوت دے جائے۔ تاکہ باطن کی وسیع دنیا کا ادراک پیدا ہوسکے اور ان کی شخصیت میں دینی اعتبار سے استقامت پیدا ہو۔

(۳)

مولانا محمد سلیمان طاہر عالم دین ہیں، صحافی ہیں، اسلامی انقلاب کے داعی ہیں، سب سے بڑی بات یہ کہ وہ صائب رائے ہیں، زندگی کے سینکڑوں مسائل میں ان کی رائے اتنی وزنی اور قیمتی ہوتی ہے کہ فرد ان کی ذہانت پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میاں محمد شوکت مرحوم کہتے تھے کہ مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب اگر ''زندگی کے معاملات میں مشوروں کے لئے رجوع ہوں'' کا بورڈ لگا کر بیٹھ جائیں تو خلق خدا کی بہتری ہو اور انہیں عملی مسائل میں اچھی رہنمائی حاصل ہو۔

محمد سلیمان طاہر صاحب ٹھیڑھی ضلع خیرپور میرس کے مدرسہ جامعہ دینیہ دارالھدیٰ کے فاضل ہیں۔ حضرت مولانا حمادالله ہالیجویؒ کے صحبت یافتہ ہیں، ان کے عزیز بھی ہیں۔ جامعہ دارالھدیٰ ٹھیڑھی میں تعلیم کے لئے موصوف کو حضرت ہالیجوی

ؒ صاحب نے ہی بھیجا تھا، ٹھیڑھی میں اس وقت کے فاضل مولانا فضل اللہ صاحب، مولانا مودودی کی فکر سے متاثر تھے، مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب نے ان کی صحبت کے زیر اثر مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، اس دور میں سندھ میں جماعت اسلامی کے روح رواں مولانا جان محمد بھٹو صاحب تحریکی دوروں کے دوران ٹھیڑھی میں آتے تھے، مولانا محمد سلیمان صاحب کی وہاں مولانا جان محمد بھٹو صاحب سے کافی ملاقاتیں ہوئیں، اس طرح موصوف جماعت کی فکر کے قریب ہوتے گئے۔ ٹھیڑھی میں ۱۹۶۰ء میں مدرسہ سے فراغت کے بعد موصوف نے کچھ وقت ٹنڈو غلام علی ضلع بدین میں دینی درسگاہ قائم کرکے وہاں کام شروع کیا، اکتوبر ۱۹۶۵ء تک وہ جامع مسجد کے خطیب بھی رہے، اس کے بعد نومبر ۱۹۶۵ء میں موصوف نے مولانا جان محمد بھٹو صاحب کے ایماء پر جماعت اسلامی ضلع سکھر کے امیر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا، موصوف کا میرے ساتھ تعلق اسی وقت سے ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک وہ ضلع سکھر جماعت کے امیر رہے۔

۱۹۷۰ء میں میں جب جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے دفتر میں شعبہ نشرواشاعت میں کام کے سلسلہ میں حیدرآباد منتقل ہوا تو اس کے بعد تقریبا سال ڈیڑھ کے بعد مولانا موصوف بھی سکھر سے حیدرآباد منتقل ہوئے، موصوف کچھ وقت محمد بن قاسم ادبی سوسائٹی کا کام سنبھالتے رہے، اس کے بعد وہ جماعت اسلامی ضلع حیدرآباد کے امیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس سارے عرصے میں مولانا سے میرا گہرا تعلق رہا، چونکہ میں اس زمانے میں روزنامہ ''جسارت'' کراچی کا وقائع نگار خصوصی تھا، ہر ماہ سندھ کی صورتحال کے علاوہ ملی وقومی مسائل پر پانچ چھ تجزیاتی مضامین لکھنا، یہ میری منصبی ذمہ داری تھی، اس زمانے میں مضامین کے سلسلہ میں مجھے مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب سے زیادہ سے زیادہ فکری رہنمائی ملتی تھی۔ جب موصوف، سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے تھے اور ملک کو سیاسی ومعاشی واخلاقی بحران سے نکالنے کے سلسلے میں خاکے پیش کرتے تھے، اس میں کئی ایسے نکات نکل آتے تھے، جسے بنیاد بنا کر میں مضامین مرتب کرتا تھا، اس طرح مضامین کے سلسلہ میں جب بھی مجھے کوئی موضوع اور نکات مطلوب ہوتے تھے تو مولانا موصوف سے تفصیلی تبادلہ خیال کرتا تھا، اس سے ذہن میں

کسی نہ کسی مضمون کا خاکہ تیار ہوجاتا تھا، مولانا کی ذہانت کو دیکھ کر تعجب آمیز خوشی محسوس ہوتی تھی، لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا تھا کہ ایسا باصلاحیت، قیمتی اور ذہین فرد مستقل مزاجی سے کسی ادارے میں جم کر کام کرنے سے قاصر ہے، جس کی وجہ سے معاشرہ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے استفادہ سے محروم ہے۔

لندن میں ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کا ادارہ مسلم انسٹیٹیوٹ ہر سال اسلامی انقلاب اور مسلم امت کے مسائل پر غور وفکر کے لئے مسلمان ممالک کے عالموں اور دانشوروں کی بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کرتا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں زبیر عمر صاحب جو مکتہ المکرّمہ میں کسی اسکول میں استاد تھے، (موصوف کافی وقت تک اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم رکن رہے) انہوں نے مسلم انسٹیٹیوٹ سے میرا تعارف کرایا اور اس وقت تک میری شائع شدہ کتابیں بھی ان کو دیں، ۱۹۸۳ء میں انسٹیٹیوٹ کی طرف سے سالانہ سیمینار میں افراد کے انتخاب کے سلسلہ میں ڈاکٹر غیاث الدین صاحب (جو کسی زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن تھے) کراچی آئے، موصوف نے نومبر ۱۹۸۳ء میں ہونے والے سیمینار میں شرکت کے لئے مجھے دعوت نامہ دیا اور اس کے ساتھ انقلابی ذہن اور فکر کے حامل دوسرے افراد کی نشاندہی کے لئے بھی کہا، میں نے انہیں فوری طور پر مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کا نام دیا۔ اس طرح سندھ سے اس سیمینار میں شرکت کے لئے میرے ساتھ مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب بھی شریک ہوئے۔ اس سیمینار کے لئے موصوف کا مقالہ ''اسلام میں جماعتوں کا تصور'' کافی سے زیادہ پسند کیا گیا، بالخصوص ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کو یہ مقالہ بہت پسند آیا۔ سیمینار کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں کے عالموں اور دانشوروں سے ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب اور ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی صاحب کی اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی انقلاب کے لئے فضا ہموار کرنے کے سلسلہ میں تفصیلی نشستیں ہوئیں، اسی قسم کی نشستیں ہمارے ساتھ بھی ہوئیں، جن میں مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب، امان اللہ شادیزئی صاحب، بلگرامی صاحب اور علی سرور صاحب وغیرہ شریک ہوئے۔ اس سیمینار میں شرکت کے بعد ہم مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کے عزیز فضل الرحمٰن بخشی صاحب کے ساتھ برمنگھم گئے، کافی دن

وہاں رہے۔

میں اس وقت روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں وقائع نگار خصوصی کی حیثیت سے کام کررہا تھا، چند ماہ تک مسلم انسٹیٹیوٹ کی انقلابی سرگرمیوں سے میرا تعلق رہا، لیکن چونکہ ان دنوں میری نظر میں سندھ میں اسلامی نظریاتی لٹریچر کی تخلیق کا کام زیادہ اہم ہوگیا تھا، میرا تجزیہ تھا کہ جب تک سندھ میں جی ایم سید کی فکر کے ازالہ اور ترقی پسند نظریات کے علمی رد اور اسلامی نظریے کے لئے ذہن سازی کا کام بڑے پیمانہ پر نہ ہوگا، اس وقت تک اسلامی انقلاب کے لئے راہ کی ہمواری کا کام تو دور کی بات ہے، معاشرے کو فکری، سیاسی اور اجتماعی انتشار اور زوال سے بچانا بھی مشکل ہے۔ ایسی صورتحال میں اسلام کے لئے افراد کا ملنا ہی مشکل ہے، اس تجزیے کے بعد میں نے ذہنی اور عملی طور پر مسلم انسٹیٹیوٹ سے اپنا تعلق ختم کر دیا اور اس سارے کام کے لئے مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کو زیادہ موزون سمجھ کر یہ کام مولانا موصوف کے حوالے کر دیا۔

مولانا موصوف اپنی ذہانت اور منصوبہ بندی کی صلاحیت کی وجہ سے ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے اسلامی انقلاب کی فکر میں کافی آگے بڑھتے گئے، اس سلسلہ میں کراچی میں مرکز قائم کیا گیا اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کے حامل افراد کو ذہنی طور پر مزید تیار کرنے کے لئے ایک ماہانہ رسالہ ''الفجر'' کے نام سے جاری کیا گیا اور سندھی میں ''نئیں سوچ'' کے نام سے بھی رسالہ شروع کیا گیا۔ اس سارے عرصے میں مولانا موصوف سے میرا تعلق قائم رہا۔ لیکن پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے ناسازگار حالات، باصلاحیت اور دردمند افراد کے فقدان، روحانی قوتوں کی کمی اور اس طرح کے دوسرے اسباب کی وجہ سے پاکستان میں مسلم انسٹیٹیوٹ کا کام آگے نہ بڑھ سکا، آخر میں مولانا محمد سلیمان صاحب کا انسٹیٹیوٹ سے تعلق رسمی نوعیت کا باقی رہا۔

مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کئی خوبیوں اور اوصاف سے نوازا ہے۔ وہ غیرمعمولی ذہین ہیں، قومی اور ذہنی مسائل پر ان کی رائے کافی وزنی ہے۔ دوست بنانے کے معاملہ میں بھی وہ کافی آگے ہیں۔ اجتماعات، کانفرنسیں اور دعوتی اور

عملی نشستوں کے انعقاد اور پروگراموں کو کامیاب بنانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، جرأت اور ہمت کے صاحب بھی ہیں۔ نئے حالات اور مشکل مراحل میں فکری طور پر راہیں نکالنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ سندھ میں ایک دور میں ربیع الاول میں جمعیت اتحاد العلماء پاکستان کے پلیٹ فارم سے سیرت کے موضوع پر سارے سندھ میں جلسے اور کانفرسیں منعقد ہوتی تھیں، ان کانفرنسوں کی منصوبہ بندی مولانا سلیمان صاحب ہی کرتے تھے۔

موصوف کی ایک کمی جس نے انہیں دعوتی، تحریکی اور نظریاتی طور پر آخر میں معطل ہونے اور سب سے منقطع ہو کر ایک طرف ہونے پر مجبور کیا، وہ ان کا مستقل مزاجی کا فقدان ہے۔ مستقل مزاجی کا بیشتر تعلق روحانیت سے ہے۔ دینی کام کے لئے جب تک قابل ذکر روحانیت نہیں ہے، اس وقت تک داعی اتنے مسائل، مشکلات اور ردعمل کا شکار ہوتا ہے، جس کا کوئی شمار نہیں۔ اس ایک چیز کی کمی کی وجہ سے ساری صلاحیتیں فرد کو استقامت نصیب کر سکیں، مشکل ہے۔

(۴)

۱۷ اگست ۱۹۹۷ء

برادر محترم حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مجھے یاد ہے کہ نومبر ۱۹۶۵ء میں آپ کے گاؤں جندوڈیرو میں پہلی بار آپ سے ملاقات ہوئی تھی، اس وقت آپ کی عمر کوئی ۱۴۔ ۱۵ سال کے لگ بھگ تھی، لیکن اس وقت میں نے دیکھا کہ آپ ماہانہ ''ترجمان القرآن'' کے پرانے فائل پڑھ رہے تھے، یہ عمر عام طور پر کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ اور اس عمر میں علمی مطالعہ اور نظریاتی سیاسی مضامین کا فہم نہیں ہوتا، لیکن آپ کا غیرشعوری دور میں بھی مطالعہ کا ذوق دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ علمی ذوق آپ کو کسی منزل پر ضرور پہنچائے گا۔ اس کے بعد سکھر میں دارالعلوم (منزل گاہ) میں دوران تعلیم، بعد ازاں حیدرآباد میں روزنامہ 'الوحید' میں صحافتی زندگی کی شروعات میں آپ کی لگن اور حوصلہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کی شخصیت میں آگے

بڑھ کر کام کرنے کا بنیادی جوہر موجود ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد حیدآباد میں لگاتار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس وقت آپ کے مضامین اور سیاسی تجزیوں کو بڑی تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس وقت یہ بھی اندازہ ہوا کہ آپ میں کسی شخصیت سے اخذ کرنے کی صلاحیت بہتر طور پر موجود ہے اور تبادلہ خیال کے نتائج کو اپنے طور پر پیش کرنے کا ملکہ آپ کے اندر موجود ہے۔ کسی سندھی جریدہ کے اجراء اور ادبی محاذ پر کام کرنے کے لئے ہماری کئی میٹنگیں ہوتی رہیں۔ کچھ دوست بھی شامل رہے۔ بہرحال ۱۹۸۴ء کے بعد آپ مستقل مزاجی سے، عزم وحوصلہ سے اور زندگی کے مقصد کو پوری دیانتداری سے اور خاص طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تقرب کے حصول کے لئے جو محنت وجدوجہد کررہے ہیں، وہ قابل تحسین ہے۔ اس کا بہترین اجر یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا۔ لیکن اس دنیا میں عام مسلمانوں بالخصوص سندھ کے اہل علم طبقہ اور سندھی نوجوانوں کے لئے آپ کی طرف سے جو علمی اور نظریاتی رہنمائی اور تربیت کا کام ہورہا ہے وہ منفرد نوعیت کا کام ہے۔

بیسویں صدی کے آخری دوعشروں میں دینی اور نظریاتی کتابوں کی اشاعت کا کام اور ماہانہ 'بیداری' کی اشاعت کے ذریعہ سندھی عوام تک اسلامی فکر کا پیغام پہنچانا ایک ایسا مبارک کام ہے، جو آپ کے ذریعہ عمل میں آیا۔ اس کام میں جو برکت اور اثر انگیزی تھی، اس کا بڑا حصہ یقینی طور حضرت اقدس ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں مدظلہ العالی کی دعاؤں اور توجہات کا نتیجہ ہے۔

کسی بھی دینی کام میں اثر انگیزی اور اس کام کے مطلوبہ نتائج دوچیزوں پر موقوف ہیں۔ ایک اخلاص نیت یعنی یہ کہ کام خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا جائے دوم یہ کہ کام عزم وحوصلے سے، پوری محنت وجدوجہد سے مستقل مزاجی کے ساتھ کیا جائے۔

سندھ میں پچھلی نصف صدی میں علمی، ادبی اور اشاعتی محاذ پر جو کام ہوئے، اس میں سیکولر عناصر کا کام بڑے پیمانہ پر اور بڑی محنت سے ہوا ہے، کئی اشاعتی ادارے وجود میں آئے، چھوٹے کتابچوں سے لیکر روزنامہ اخبارات تک بے شمار مواد تیار ہوا اور وہ سندھ کے گاؤں گاؤں پھیل گیا، اس سارے کام کے نتیجہ میں سندھ کا تشخص کسی حد تک سیکولر

سندھ کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ اس پورے کام میں سوویت یونین اور بھارت کے تعاون کے علاوہ مقامی دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی مشترکہ محنت کو بھی عمل دخل حاصل ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں ادبی محاذ پر اسلامی طبقہ کے ادیبوں اور دانشوروں کی کوئی خاص منصوبندی، تنظیمی کاوش، وسائل کی یکجائی اور مثبت فکر کے لئے لگاتار جدوجہد کم ہی نظر آتی ہے۔

۱۹۶۰ع کی دہائی میں حیدرآباد میں سید سردار علی شاہ اور ان کے دوستوں کا حلقہ نمودار ہوا، لیکن اس حلقہ کی طرف سے کوئی مثبت لٹریچر فراہم نہ ہو سکا، البتہ لادینی فکر اور اس کے پیش کرنے والوں کا تعاقب ضرور ہوا اور پریس کے ذریعہ انہیں بے نقاب کیا گیا۔ جماعت اسلامی کی سرپرستی میں محمد بن قاسم ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی، سوسائٹی نے اپنی دس سالہ جدوجہد میں سندھ میں مختلف سیمینار منعقد کئے، کچھ کتابیں بھی شایع ہوئیں، لیکن سوسائٹی کے مقاصد میں منفی (تنقیدی پہلو) غالب رہا۔ مگر اس کے بعد سوسائٹی اپنا وجود قائم نہ رکھ سکی، سکھر میں تنظیم فکر ونظر قائم ہوئی، اس تنظیم کی سرگرمیاں بھی زیادہ تر سیمینار کے انعقاد تک محدود رہیں۔ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں ضرور شائع ہوئیں۔ مگر حکمرانوں کی مداخلت کی وجہ سے تنظیم میں انتشار پیدا ہوا، جو، اب تک اس کے وجود کو نقصان پہنچارہا ہے۔ کچھ وقت ادبی محاذ پر خلا رہا، اب دس پندرہ سال سے پھر ایک نئی لہر شروع ہوئی ہے، کراچی میں 'نئی سوچ' کے ذریعہ مثبت فکری محاذ کھلا، شکارپور میں دینی، علمی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں اکیڈمی وجود میں آئی اور حیدرآباد میں سندھ نیشنل اکیڈمی کے ذریعہ دینی علمی کتابوں کی اشاعت کا وسیع سلسلہ شروع ہوا اور ماہانہ رسالہ کا بھی اجرا ہوا۔

ہمارے دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بالائی طبقے یعنی اہل علم بالخصوص داعیانہ منصب پر فائز شخصیتوں میں بردباری، عفودرگذر اور دوسرے کی تکریم کا مادہ کم ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے ایک دوسرے سے تعاون اور مشترکہ مقاصد کے لئے مشترکہ کوششوں کا سخت فقدان ہے۔ اس کے ساتھ ہماری ایک بڑی کمی دردمند اور سوزوگذار کی کیفیت سے لبریز قلب مطمئنہ کی غیرمعمولی کمی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے دین کے لئے بڑے کام ہونا ممکن نہیں۔ اگر کام شروع بھی ہوتے ہیں تو ان میں برکت اور نصرت الٰہی پیدا نہیں ہوتی، چنانچہ کچھ وقت کے بعد وہ کام ختم ہوجاتے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اہل اللہ سے منسلک کردیا ہے، جس کی وجہ سے آپ کا دل حرارت، گرمی، جذبہ اور اخلاص سے لبریز رہتا ہے اور باطنی بیماریوں کے احتساب کے لئے بھی اندر کا محتسب ہر وقت بیدار رہتا ہے، اس کی بر وقت فتویٰ کے پیش نظر اندر کی اصلاح کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ایسا دعوتی، دینی اور اجتماعی کام جس میں اہل اللہ کی صحبت اور خوداحتسابی کا عمل پوری قوت سے موجود ہے۔ وہ کام ہر قسم کے خلفشار سے محفوظ رہتا ہے۔ **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' ستمبر ۲۰۱۴ء)**

والسلام

محمد سلیمان طاہر

مولانا احسان الحق

مولانا احسان الحق صاحب عالم دین ہیں، صوفی ہیں، خدمت دین کا درد وجذبہ رکھتے ہیں۔ مریدوں کا وسیع حلقہ ہے، جن کی تربیت کا وہ کام کرتے ہیں، موصوف وسعت فکر ونظر کی حامل شخصیت ہیں، مطالعہ کا غیرمعمولی شوق رکھتے ہیں،تصوف اور اسلامی علوم کے علاوہ دور جدید کے چیلنج کے حوالے سے شایع ہونے والے لٹریچر پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ مولانا موصوف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آنے والوں کیلئے ہر وقت دستیاب ہوتے ہیں، اور انہیں اتنا وقت دیتے ہیں کہ ان کی تشنگی دور ہوجاتی ہے۔

موصوف کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف ذہنی سطح کے افراد کو ان کی علمی سطح کے مطابق مطمئن کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔

موصوف کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حلقے سے باہر کی دینی جماعتوں وتنظیموں کے ذمہ داروں سے دوستانہ تعلقات استوار کرکے معاشرہ میں خیر سگالی کی فضا کو فروغ دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اس اعتبار سے رواداری پر مشتمل ان کا کردار دوسرے علماء کے لئے قابل تقلید ہے۔

مولانا احسان الحق صاحب نے سب سے پہلے کوئٹہ کے مولانا عبدالعزیز نقشبندی سے فیض حاصل کیا، ان سے نقشبندی سلسلہ کے اسباق طے کرکے، خلافت کی سعادت حاصل کی۔ اس کے باوجود موصوف نے تشنگی محسوس کی اور مولانا عبدالحیؒ سے سات آٹھ سال تک صحبت کا تعلق قائم رکھا، ان کی طرف سے بھی انہیں جلد ہی دوسروں کی تربیت کی اجازت حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ سے خلافت ملنے کے بعد مولانا سے ان کا روحانی تعلق اور صحبت ورابطہ میں مزید اضافہ ہوا، اس لئے کہ انہیں محسوس ہوا کہ مولانا موصوف شریعت میں استقامت اور طریقت کے معاملے میں سلف کا زندہ نمونہ ہیں، ان سے

روحانی طور پر جتنا بھی اضافہ کیا جائے، وہ کم ہے۔

موجودہ دور میں تصوف کی نام پر جو افراط و تفریط پیدا ہوگئی ہے، وہ المناک بات ہے۔ مرید بنانے کی دوڑ شروع ہوگئی ہے۔ اس مقصد کے لئے اپنے متعلقین میں اپنے کشف والہام کے صاحب ہونے اور اپنی غیر مرئی شخصیت ہونے کا نقش بٹھانے کی کاوش ہوتی ہے۔ مال بنانے کے لئے مالداروں سے تعلقات کے استحکام کی کاوش ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ، بڑی مسرت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو اہل تصوف میں عام طور پر ہونے والی ان خرابیوں سے بچایا ہے اور ان پر اپنی اصلاح کی فکر کو غالب کیا ہے۔

بعض اوقات انہیں بہتر خواب اور کشف کے ذریعہ جو باتیں القا ہوتی ہیں اگر وہ اخفا رکھنے کی بجائے یہ باتیں عام کریں تو انہیں شہرت بھی حاصل ہوسکتی ہے تو مال اور ان کے مریدوں میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے، لیکن اس معاملے میں ان کی شخصیت پر مولانا عبدالحیؒ کی صحبت کا اثر ونقش غالب ہے، وہ ان چیزوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

مولانا موصوف کو خطابت کی بہتر صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں۔ ان کی تقریر سے دلوں میں وقتی طور پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور ان کی طرف کشش پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ یقیناً ان کے دلی اخلاص کا اثر ونتیجہ ہے۔

اللہ نے موصوف کو اچھی آواز سے قرآن پڑھنے کی سعادت بھی بخشی ہے۔ ان کی تلاوت سن کر دل چاہتا ہے کہ وہ پڑھتے رہیں اور حلاوت محسوس ہوتی رہے۔

مولانا احسان الحق صاحب کے یہاں دو دن کا جو سالانہ روحانی اجتماع ہوتا ہے، اس اجتماع میں تصوف وراہ سلوک اور اصلاح نفس کے حوالے سے جو تقاریر ہوتی ہیں، وہ تقاریر بھی علمی اعتبار سے بہتر اور مفید ہوتی ہیں۔ تصوف سے تعلق خاطر نہ رکھنے والے افراد کے لئے بھی یہ تقاریر قابل قبول ہوتی ہیں۔ یہ مولانا کے علمی ذوق کی علامت ہے، ورنہ اس عاجز نے متعدد روحانی اجتماعات میں دیکھا ہے کہ علمی اعتبار سے تقاریر کا معیار بہت کمزور ہوتا ہے، اہل اللہ کے شان میں قصیدے، ان کی غیرمرئی قوتوں اور واقعات کا ذکر اور کشف وکرامات کا پہلو غالب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مریدوں کی ذہن سازی شخصیت پرستی کی بنیاد پر ہونے لگتی ہے۔

موصوف مولانا عبدالحیؒ کی شخصیت کی بعض ایسی باتیں بتاتے ہیں، جس سے ایمان تازہ ہوتا ہے اور غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بتایا کہ مولانا کے ایک خلیفہ حضرت کو اپنے کشف کے واقعات بتانے لگے، اس پر حضرت مولانا نے انہیں کہا کہ کشف سے نکلو اور معرفت کی طرف آؤ، کشف بھول بھلیوں کا راستہ ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے والد ماجد خواجہ شمس الدین سید پوری، جو اپنے دور کے اکابر بزرگوں میں شامل تھے، کا ایک واقعہ بھی بتایا کہ آپ پر دوران ذکر ومراقبہ کشف کی راہ کھل گئی، اس پر آپ کو تشویش ہوئی اور دعا کی کہ یا اللہ میں نے آپ سے معرفت کی التجا کی ہے، کشف کی نہیں، کشف مجھ سے واپس لیلے اور اپنی معرفت نصیب فرما، چناچہ آپ کی دعا قبول ہوئی، کشف واپس ہوا اور آپ کو معرفت کا وافر حصہ عطا ہوا۔

مولانا احسان الحق صاحب بتاتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرماتے ہیں کہ دو معاملات میں محتاط ہونا چاہیے، ایک نماز جنازہ پڑھانے کے معاملہ میں، دوسرے نماز میں امامت کے معاملے میں۔ اس لئے کہ بالخصوص ان دونوں معاملہ میں نفس کی آرزو ہوتی ہے کہ اسے آگے بڑھنے کا موقعہ ملے، اس طرح مولوی اور صوفی کے جذبہ انانیت ودعویٰ میں اضافہ کا خطرہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے اپنا ایک واقعہ بھی بتایا کہ ہمارے ہاں ایک جنازہ ہوا، مجھے لوگوں نے امامت کے لئے آگے کیا، میں نے دیکھا کہ پہلی صف میں میرے پیچھے قاضی صاحب کھڑے ہیں، میں نے ان کے مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ حضرت، کیا میں نماز پڑھا سکتا ہوں، انہوں نے کہا، نہیں، چناچہ میں بغیر کسی تحفظ کے پیچھے ہوا اور قاضی صاحب نے آگے بڑھ کر امامت کی۔ انہوں نے جب دوسری بار اللہ اکبر کہا تو ان پر فالج کا حملہ ہوا، اسی فالج کے حملہ میں ہی موصوف اسی دن انتقال کر گئے، ان کے بیٹوں کے اصرار پر ان کا جنازہ نماز میں نے پڑھایا۔

مولانا احسان الحق صاحب سے ہمارے تعارف ودوستانہ تعلقات کی سبیل اس طرح پیدا ہوئی کہ انہیں کوئٹہ میں کہیں سے ''بیداری'' کا پرچہ ملا، ''بیداری'' کی مضامین پڑھ کر انہیں ہمارے ساتھ طبعی مناسبت پیدا ہوئی، موصوف نے فون کیا اور کہا کہ آپ

جدید دور کی افراد کے سامنے تصوف وروحانیت وراہ سلوک کو جس عملی انداز میں پیش کررہے ہیں، اس کی سخت ضرورت ہے، میں چاہتا ہوں کہ ''بیداری'' اور آپ کی کتابوں سے استفادہ کروں، ہم نے مولانا کی خدمت میں اپنی کتابوں کا سیٹ ارسال کیا، اس طرح ان سے دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوتا رہا۔

انہیں ''بیداری'' اور ہماری کتابوں کی بارے میں یہ حسن ظن ہے کہ ایک تو ان سے سلف کی اسلامی فکر پر اعتماد پیدا ہوتا ہے، دوم یہ کہ عہد جدید کے مسائل وچیلنج کو سمجھنے اور ان سے عہد برآ ہونے کی صلاحیت ابھرتی ہے، یہ ان کا حسن ظن ہے۔

مولانا کا ہمارے ساتھ حسن ظن کا معاملہ اتنا بڑھا کہ ہر اہم معاملہ میں موصوف ہمارے ساتھ مشاورت کرتے رہے ہیں۔

پانچ سات سال پہلے مولانا نے اپنی سالانہ روحانی تقریب میں ایک مشہور مولانا کو مدعو فرمایا۔ دوسرے سال کی تقریب میں ان مولانا کے ساتھ ایک دوسرے ممتاز عالم کو بھی مدعو فرمایا، پہلے سال شریک ہونے والے حضرت مولانا صاحب تو اس اجتماع میں تشریف نہیں لائے، جب کہ دوسرے ممتاز عالم (جو صاحب روحانیت شخصیت بھی ہیں) وہ شریک ہوئے، ان موصوف نے اپنی تقریر میں اشتہار میں شامل دوسرے مولانا پر سخت تنقید کی اور ان کی اسلامیت کو مشکوک قرار دیا، ان مولانا موصوف کی روحانی حیثیت مسلمہ تھی اور مولانا احسان الحق صاحب، صاحبِ روحانیت شخص کی بات کو مسترد کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، پروگرام کے بعد موصوف نے اس کی روئداد سے مجھے واقف کیا اور بتایا کہ میں نے بھی اپنی تقریر میں اعلان کر دیا کہ اگر متعلقہ مولانا ایسے ہی ہیں تو ان کے خلاف جہاد میں ہم حضرت مولانا کے ساتھ ہوں گے، میں نے انہیں عرض کیا کہ ہمارے ہاں بعض روحانی شخصیتوں کا مشاہدہ صحیح نہیں ہوتا، اور معاملات کے سارے پہلو ان کے علم میں نہیں ہوتے، اس سلسلہ میں عاجز نے انہیں بتایا کہ سندھ میں ایک بڑی روحانی شخصیت تھی، جن کے تقویٰ، جن کا زہد اور جن کی للھیت وفنائیت قابل رشک تھی، جن کے ذریعہ ہزارہا افراد کی زندگیاں بدلیں، ان موصوف نے غالبا اپنے کشف کی بنیاد پر (اس وقت کے) صدر ضیاء الحق صاحب کے قادیانی ہونے کا فتویٰ دیا اور اس پر موصوف شدت سے مصر رہے، حالانکہ صدر ضیاء الحق نے پریس کانفرنس کے ذریعہ اس کی سختی سے تردید کی اور اس دور کے بعض بڑے

اکابر بزرگ صدر ضیاء الحق سے اسلامی اعتبار سے غیر معمولی حسن ظن بھی رکھتے تھے۔ اور صدر ضیاء الحق ان کی ملاقات کے لیے کوشاں بھی رہتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلط کشف یا غلط معلومات کی بنا پر بزرگوں سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں، یہ غلطیاں نتائج کے اعتبار سے سخت نقصاندہ بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے مولانااحسان الحق صاحب سے عرض کی کہ ان مولانا پر حضرت مولانا موصوف نے جو الزامات لگائے ہیں، ان ساری باتوں کو آپ سوالنامہ میں تحریر کرکے مولانا کی خدمت میں بھیج دیں، تاکہ ان کا نقطہ نگاہ ان کے اپنے الفاظ میں واضح ہوسکے۔

ہمارے مشورہ پر موصوف نے ایسے ہی کیا، اور ان مولانا کی خدمت میں تفصیلی سوالنامہ ارسال کیا، ان موصوف نے تفصیل سے اس کا جواب دیا، ان کے جواب سے واضح ہوا کہ یہ ساری صورتحال غلط فہمیوں اور ایک دوسرے سے دوری اور بعض جزوی نوعیت کی کمزوریوں سے استناد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

ایک دوسرا معاملہ جس میں مولانا موصوف نے مجھ سے مشاورت کی، وہ مضاربت کے کاروبار کا معاملہ تھا، مضاربت کے حوالے سے کاروبار میں شرکت کا یہ نیا سلسلہ شروع ہوا تھا، بعض علماء نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مولانا احسان الحق صاحب نے فرمایا کہ ظاہری طور پر میرا کوئی خاص ذریعہ معاش نہیں ہے، سوچتا ہوں کہ مضاربت کے اس کاروبار میں شرکت کروں، میرے ساتھیوں ودوستوں میں ایسے افراد ہیں میرے کہنے سے اس میں حصہ لینے پر آمادہ ہوجائیں گے، مجھے مضاربت سے کچھ رقم مل جائے گی۔

میں نے عرض کیا کہ مضاربت کے کاروبار کی نوعیت وحقیقت کا تو مجھے علم نہیں ہے، اس معاملہ میں آپ سوچ سمجھ کر جو بھی فیصلہ کریں، وہ آپ کرسکتے ہیں، لیکن مجھے اپنے لئے اور آپ کے لئے توکل کی راہ ہی زیادہ بہتر اور افضل نظر آتی ہے۔ صاحبان دل کو معاش کے معاملے میں پریشان ہرگز نہ ہونا چاہیے، وہ اخلاص کے ساتھ طالبوں کی اخلاقی وروحانی تربیت کے جس کام میں لگے ہوئے ہیں، اللہ انہیں معاش کے معاملہ میں دوسروں کا ہرگز محتاج نہیں بنائے گا۔

مولانا موصوف نے اس عاجز کے مشورہ کو قبول کیا اور مضاربت کی اسکیم میں حصہ نہیں لیا۔

فضل مبین احمد

فضل مبین احمد صاحب بھی فروری ۲۰۱۶ء کی ابتدا میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف جمعیۃ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے بانیوں میں شامل تھے، موصوف بانیٔ ٹرسٹ حاجی محمد رفیع صاحب کے ساتھ جمعیۃ کے کام کے فروغ کے لئے ان کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہتے تھے۔یہ دونوں اصحاب صبح کی نماز پڑھکر اپنی کاوروباری برادری کے افراد کے پاس جاتے اور انہیں جمعیۃ کے ساتھ مالی تعاون کے لئے آمادہ کرتے، اس طرح ''جمعیۃ تعلیم القرآن'' کا کام چند سالوں کے اندر اندر ملک بھر میں پھیل گیا۔ اور ملک بھر میں قرآنی تعلیم کے دو تین ہزار مکتب کھل گئے۔

حاجی محمد رفیع صاحب نقشبندی سلسلہ میں ایک بزرگ سے بیعت تھے اور ان بزرگ سے انہیں خلافت بھی حاصل تھی، عالمگیر مسجد میں موصوف روزانہ صبح کی نماز کے بعد مراقبہ بھی کراتے تھے، حاجی صاحب کے برعکس فضل مبین احمد صاحب مولانا مودودی کی فکر کے حامل تھے، اگرچہ ان کا جماعت اسلامی سے باضابطہ تعلق نہیں تھا، حاجی صاحب سے ان کے دست راست کی حیثیت سے کام کرنے سے ان کی وسعت ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف تعاونوا علی البر کے اصول پر قائم تھے، دین کے لئے ہونے والے ہر کام کو اپنا ہی کام سمجھتے تھے۔

موصوف علمی اعتبار سے کوئی اہم شخصیت نہیں تھے۔ نہ ہی تبادلہ خیال کی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ سیدھے سادے مسلمان تھے، صاحب اخلاص تھے، خدمت دین کا درد رکھتے تھے۔ حمیت دین کے صاحب تھے۔ سب کے ساتھ حسن ظن رکھتے تھے۔ دین کی مظلومیت پر کُڑھتے تھے، ان کی برادری، جو کاروباری ا فراد پر مشتمل ہے،اس برادری کا ان کی شخصیت پر غیرمعمولی اعتماد تھا۔ ان خوبیوں وصفات کی وجہ سے انہیں دین وملت کے لئے بہت زیادہ خدمات سرانجام دینے کی سعادت حاصل رہی۔

موصوف کا فکری طور پر مولانا مودودی سے تعلق رہا، مولانا مودودی سے گہرے مراسم بھی رہے۔ لیکن ان میں مولانا مودودی کے علاوہ دوسری فاضل شخصیتوں سے استفادہ کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ مولانا وحید الدین خان کے ''الرسالہ'' کے قاری تھے۔ اصلاح نفس اور فکر آخرت کی حوالے سے وحید الدین خان کی فکر سے متاثر تھے،البتہ ان کی فکر کے دوسرے اجزاء کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

فضل مبین احمد صاحب، ادارہ تعمیر ملت منصورہ سندھ کے صدر بھی رہے۔ اس ادارہ کے تحت منصورہ سندھ میں ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' کے نام سے بڑی دینی درسگاہ قائم ہے، جس میں ملک بھر بالخصوص اندرون سندھ کے پانچ سو سے زیادہ طلبہ پڑھتے ہیں۔

جامعہ میں دورہ حدیث تک تعلیم ہے اور طلبہ کو بی اے اور مولوی فاضل بھی کرانے کا اہتمام ہے۔

موصوف طویل عرصہ تک اس ادارہ کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور عمر رسیدگی کے بعد جب صدارت سے مستعفی ہوئے تو ادارہ تعمیر ملت کو چلانے کے لئے اپنی برادری کے متعدد افراد کو تیار کیا، اس طرح یہ ادارہ ان کی کوششوں سے بہتر کام کررہا ہے۔

جامعۃ علوم الاسلامیہ منصورہ ۱۹۹۷ء میں ایک بحران سے بھی دوچار ہوا کہ جامعہ کے اس وقت کے صدر مدرس نے کوشش کی کہ ان کے استاد (جو ادارہ تعمیر ملت کے سیکریٹری بھی تھے اور اخلاص وتقویٰ میں بلند مقام پر فائز تھے) انہیں اور ان کے متوسلین کو ایک طرف کرکے، جامعہ پر ان کی شخصیت مکمل طور پر حاوی ہوجائے، اس مقصد کے لئے موصوف نے ادارہ کے سارے ذمہ داروں کو اعتماد میں لے لیا تھا، سیکریٹری صاحب (جو ۱۹۵۴ء سے اس ادارہ سے وابستہ تھے) وہ درویش قسم کی شخصیت تھے، انہوں نے ادارہ کے ممبران سے مل کر اپنے لئے کوئی فضا ہموارنہیں کی، ان کا کہنا تھا کہ اللہ کے یہاں فیصلے اخلاص کی بنیاد پر ہوتے ہیں، اس لئے اگر میں حق پر ہوں اور ادارہ کے ساتھ میری وابستگی محض اللہ کے لئے ہے تو مجھے ممبران کو قائل کرنے اور اپنا نقطہ نگاہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، چنانچہ جب اجلاس ہوا تو اس میں بہت

زیادہ گرما گرمی ہوئی۔ فضل مبین احمد صاحب جنہوں نے ادارہ کے لئے خون پسینہ صرف کیا تھا۔ انہیں یہ دیکھکر بہت صدمہ ہوا اور دل کی تکلیف بھی ہوئی، اس موقعہ پر محترم سیکریٹری صاحب کا اخلاص کام آیا۔ اور صدر مدرس (جو ۱۷ سال تک اس حیثیت سے کام کرتے رہے) انہیں ادارہ سے رخصت ہونا پڑا۔

اس واقعہ کا ذکر اس لئے ہوا، تاکہ معلوم ہو کہ اداروں میں ہونے والے انتشار میں نفسانیت کے جذبات شامل ہوتے ہیں اور صاحبانِ اخلاص کی برکت سے بالآخر نفسیانیت کے حامل افراد کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اب تو اس بحران سے وابستہ لگ بھگ سارے افراد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ سب کی مغفرت فرمائے۔

فضل مبین احمد صاحب کا ایک بڑا کام سندھ میں اسلام کو درپیش چیلنج کے حوالے سے ہونے والے نظریاتی کام میں معاونت کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں موصوف نے ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۱ء تک ہر ماہ ہماری شائع کردہ ایک علمی کتاب خرید کر، سندھ بھر کے علمی وادبی اداروں، یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور قوم پرست تنظیموں کے ذمہ داروں کو ارسال کرنا شروع کی، اس طرح جدید نظریات پر علمی تنقید اور اسلام کی جدید اسلوب میں تشریح کے موضوع پر اہم کتابیں سندھ کے علمی حلقوں تک پہنچنے کی سبیل پیدا ہوگئی۔

۱۹۹۲ء میں ہم نے فیصلہ کیا کہ اہم موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کا کام تو ایک حد تک ہوگیا ہے، اب ترقی پسند اور قوم پرست فکر سے متاثر افراد اور مذہبی طبقہ کو اس حوالے سے علمی مواد وعلمی رہنمائی فراہم کرنے کے لئے سندھی زبان میں ماہانہ علمی رسالہ کا اجراء کیا جائے، جو جدیدیت کے پیدا کردہ سارے **مغالطوں** کو دور کرنے اور ابھرنے والے نئے نئے مسائل کے بارے میں اسلام اور ملت کا نقطہ نگاہ پیش کرتا رہے۔ اور صحیح ذہن سازی کا فریضہ سرانجام دیتا رہے۔

جب اس عاجز نے فضل مبین احمد صاحب کے سامنے رسالہ کا خاکہ پیش کیا تو موصوف نے اس کام کو مفید محسوس کیا اور ''بیداری'' کے اجراء کے سلسلہ میں اپنی برادری کے افراد سے اشتہارات بھی دلائے تو مالی تعاون بھی۔ اس طرح رسالہ کا کام چلتا رہا۔ ۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۵ء تک ان کے تعاون کا سلسلہ جاری رہا۔

۲۰۰۵ء کے آخر میں انہوں نے اپنی بیماری کی وجہ سے معذرت ظاہر کی اور کہا کہ اب آپ بیداری سندھی بند کردیں۔ اس عاجز نے کہا کہ یہ کام آپ کا یا میرا نہیں، جس ہستی کا کام ہے، وہی اس کام کو جاری رکھنے کی سبیل پیدا کرے گی۔ بشرطیکہ اخلاص موجود ہو، الحمدللہ سندھی بیداری کا تسلسل جاری ہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں رسالہ بندش کے خطرات سے بھی دوچار ہوا، لیکن الحمدللہ پچھلے چوبیس سال سے بیداری سندھی وقت کی پابندی کے ساتھ ہر ماہ کے ابتدائی دنوں میں شایع ہوکر، سندھ کے ہر مکتبہ فکر کے علمی حلقوں کی خدمت میں اعزازی طور پر جاتا رہتا ہے۔

یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر ضروری ہے، جماعت اسلامی سندھ کی اس وقت کی سب سے اہم شخصیت نے فضل مبین احمد صاحب کو ہماری ساتھ تعاون کرنے سے منع کیا تھا، ایسا کرنے میں وہ شخصیت ایک لحاظ سے حق بجانب بھی تھی، اس لئے کہ انہیں خطرہ تھا کہ تصوف سے وابستگی کی وجہ سے میرے علمی، دعوتی اور نظریاتی کام میں دین کا وسیع، ہمہ جہتی اور کامل تصور شامل نہ ہوگا اور اس میں تصوف ہی غالب ہوگا نیز اس تعاون سے جماعت اسلامی سے متوازی قوت ابھرے گی، لیکن الحمدللہ ہم نے تصوف کے ساتھ ساتھ اسلام کے دفاع کے محاذ کو بھی پوری استقامت سے سنبھالا۔ اور جماعت اسلامی سے بھی اپنائیت کے تعلق کو برابر قائم رکھا۔

دراصل جماعت اسلامی سے وابستہ افراد تصوف کے بارے میں کافی غلط فہمی کا شکار ہیں، الحمدللہ، ہم نے اپنے کردار سے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی، اقامت دین اور غلبہ دین کے کام کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اصل مسئلہ ترتیب کا ہے کہ اس کی ترتیب، افراد اور معاشرہ کی تبدیلی کے کام ہی سے شروع ہوتی ہے۔

ہمارا معاشرہ جس ڈگر پر چل پڑا ہے، اب اس میں اس طرح کے حمیت دین اور تعاونوا علی البر کے جذبات کے حامل افراد کا تیزی سے فقدان ہوتا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے اور ہمیں فضل مبین احمد صاحب اور محمد منصور الزمان صدیقی صاحب جیسے افراد وافر مقدار میں عطا فرمائے۔ **(آمین)**

ڈاکٹر کلیم صدیقی

ڈاکٹر کلیم صدیقی مسلم انسٹیٹیوٹ کے سربراہ تھے، جس کا مرکز لندن تھا، موصوف ۱۹۸۲ء سے ہر سال لندن میں عالمی سطح کا اسلامی سیمینار منعقد کرتے تھے، جس میں برصغیر ہند اور دوسرے مسلمان ملکوں سے علماء وفضلا اور اہل دانش کو مدعو کرتے تھے اور مسلم ممالک میں اسلامی انقلاب کے لئے کام اور جدید دور میں اسلامی حکمت عملی کے موضوع پر مقالے پڑھے جاتے تھے اور اس پر تبادلہ خیال کے بعد حکمت عملی تشکیل دیتے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں لندن میں ہونے والے سیمینار میں اس عاجز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب سے ہماری مختلف **نشستیں** ہوئیں، ان کی شخصیت متاثر کن تھی، سفید چہرہ، سنت کے مطابق داڑھی، چہرے پر وجاہت اور اپنائیت کا مزاج، اسلام کے لئے والہانہ وفدائیانہ اندازاوردوسروں کی گفتگو سننے کی ادا جیسی خصوصیات ان میں موجودتھیں، کراچی متعدد بارتشریف لائے، یہاں بھی ملاقاتیں ہوئیں، ہر بار ان کی شخصیت کے بارے میں یہی تاثر پیدا ہوا کہ وہ اسلامی انقلاب کے مقصدی کام سے نہایت مخلص اور اس کے لئے پُرجوش ہیں۔ اور سیرت وکردار کے اعتبار سے بھی مستحکم شخصیت ہیں۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب قیام پاکستان کے وقت ہندستان سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے، کراچی میں ان کا قیام ہوا، ۱۹۵۴ء میں موصوف لندن منتقل ہوگئے، وہاں انہیں مسلسل کوششوں سے ڈاکٹر غیاث الدین اور افضل بنگش جیسے دردمند افراد ملے، جن کی مدد سے انہوں نے اسلامی انقلاب کے لئے علمی وعملی کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر موصوف بنیادی طور پر مولانا مودودی کی فکر سے متاثر تھے، اور اسی فکر کو وہ

اسلام کی نصب العینی فکر سمجھتے تھے، البتہ مولانا مودودی نے اسلامی نظام اور غلبہ اسلام کے لئے جمہوریت کی جو راہ اختیار کی، وہ اس کے شدید ناقد تھے، جمہوریت کو وہ کافرانہ نظام کا حصہ سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ عالمی طاغوت بعض مسلم ممالک میں جمہوریت کے ذریعہ اسلام کی روک تھام اور اپنی تہذیب کے غلبہ کے لئے فضا ہموار کرنا چاہتا ہے، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی عالمی کفر کی اس حکمت عملی کو نہ سمجھ سکے، جس کی وجہ سے جمہوری جدوجہد میں اپنی توانائیاں صرف کرکے، انہوں نے نظام اسلام اور غلبہ اسلام کے حوالے سے اپنی فکر کو خود ہی مضمحل کر دیا۔

انقلاب کے لئے ان کی سوچ یہ تھی کہ کم ازکم پاکستان میں اسلامی انقلاب کے حوالے سے سارے خطوط واضح کئے جائیں اور جمہوریت کے ذریعہ غلبہ اسلام کی حکمت عملیوں کی کمزوریوں کی بھرپور نشاندہی کی جائے اور اس مقصد کے لئے ملک بھر میں افراد کی ٹیم تیار کی جائے۔ اس کام کے لئے انہوں نے مولانا محمد سلیمان طاہر صاحب اور خورشید گیلانی صاحب جیسی شخصیتوں کی خدمات حاصل کیں۔ موصوف نے انہیں خوب وسائل فراہم کئے اور اس مقصد کے لئے برسوں تک ماہانہ رسالے جاری رہے اور متعدد کتابیں بھی شایع ہوئیں اور ان دونوں کی معیت میں ہر سال پاکستان سے متحرک اہل علم، عالمی سیمینار میں شرکت کے لندن جاتے رہے۔ لیکن اس کام میں زیادہ پیش رفت نہ ہوسکی۔ بعد میں یہ کام بھی ختم ہوگیا۔ اس کے اسباب پر اگرغور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کام کی حامل شخصیتیں اگرخود تزکیہ کے مراحل سے گذر کر، افراد کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہ ہوں تو وسائل کے باوجود افراد کی تیاری کا کام دشوارتر ہے۔

دوسرا کمزور پہلو جو موجود رہا، وہ یہ کہ افراد کی تربیت کی طرف زور نہ ہونے کے برابر تھا، جب کہ انقلاب، انقلابی فکر اور سامراج دشمنی کے جذبات کو ابھارنے پر سب سے زیادہ زور تھا۔

تیسری کمزوری جو موجود رہی،وہ یہ کہ معاشرہ کی اسلامی خطوط پر تربیت کے ہدف پر عالمی طاغوت اور اس کے آلہ کار حکمرانوں سے معرکہ آرائی کا نظریاتی ہدف غالب تھا۔

مسلم انسٹیٹیوٹ کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ وسائل کے لئے ان کا بڑی حد تک انحصار ایرانی حکومت پر رہا۔ جب کہ ایران کے انقلابیوں کے سامنے ہدف یہ تھا کہ مسلم انسٹیٹیوٹ کے ذریعہ مسلم ممالک میں ایرانی انقلاب کے لئے فضا بہتر بنائی جائے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب ہوں یا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یا انہی جیسے حکومتی سطح پر غلبہ اسلام کے دوسرے علمبردار، انہوں نے مسلم امت کو درپیش جدید چیلنج اور اس کی نوعیت کو تو بڑی حد تک صحیح سمجھا ہے، عالمی استعمار کے خلاف ذہن سازی کے سلسلہ میں بھی مؤثر کردار ادا کیا ہے اور اسلام کی بنیاد پر اپنے گرد باصلاحیت افراد کو جمع کیا، یہ ان کے کردار کا بہت اہم اور صحتمند پہلو ہے، لیکن ایک تو وہ مسلمانوں کے صدیوں کے تہذیبی اداروں سے روحانی طور پر عدم استفادہ کی وجہ سے مسلم نفسیات اور اس کی پیچیدگیوں اور اس نفسیات کی اصلاح کی صورت اور اس کی نوعیت سے بالکل ناآشنا رہے، جس کی وجہ سے افراد کو اپنے گرد جمع کرنے کے بعد انہیں زیادہ دیر تک اپنے ساتھ قائم رکھنے اور ان کی بہتر اخلاقی اور روحانی تربیت کرکے، معاشرہ کے لئے انہیں کارگر بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

دوم یہ کہ انہوں نے مغربی استعمار کے خلاف ردعمل کا شکار ہو کر، انقلابی فکر کو دین کے نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا اور اس سلسلہ میں وہ توازن فکری سے قاصر رہے، اگر فکر میں کارکنوں اور افراد معاشرہ کی اخلاقی وروحانی تربیت کا کام پیش نظر ہوتا تو اس سے کارکنوں کی سیرت میں بھی استحکام ہوتا تو ساتھ ساتھ معاشرہ بھی اخلاقی طور پر مستحکم ہوتا اور افراد معاشرہ میں داخلی وخارجی طاغوت کے خلاف صف آرائی کی صلاحیت واستعداد پیدا ہوتی۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب جیسے اسلامی انقلاب کی حامل شخصیتوں کی حمیت دین اور جذبہ قابل قدر رہا ہے اور اس مقصد کے لئے ان کی طرف سے وقت وصلاحیتوں کے استعمال کی ادا لائق تعریف ہے، لیکن افراد کی نفسی خرابیوں کی سنگینی اور ان کی اصلاح کے کام کو ترجیحی فہرست میں شامل نہ کرنے اور اس کے لئے حقیقی فکرمندی نہ ہونے کی وجہ سے یہ انقلابی جدوجہد آگے چل کر، انقلاب کے نام پر افراد کی نفسی خرابیوں اور باطنی فساد کی نذر ہوگئی۔

ہمارے ہاں غلبہ دین کے لئے پچھلے سو سال سے فکر دی جارہی ہے۔ تحریکیں چل رہی ہیں اور ایک بڑا نظریاتی لٹریچر تیار ہوگیا ہے۔ اس پورے عرصہ میں ان تحریکوں میں شامل افراد کی نفسی خرابیوں کے بے شمار پہلو سامنے آ کر، ان تحریکوں میں انتشار وٹوٹ پھوٹ کا باعث ثابت ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود دکھ کی بات یہ ہے کہ ان تحریکوں سے وابستہ اہل علم واہل دانش نے ان تحریکوں کے نظام فکر وعمل میں تبدیلی اور تعلق باللہ کے خصوصی اہتمام، تنظیموں میں پیدا شدہ خرابیوں کے بنیادی محرک اور تزکیہ وتہذیب نفس کے کام کی طرف نہ صرف یہ کہ توجہ نہیں دی، بلکہ اس کام کو غلبہ دین کی جدوجہد کے کام کے مقابلہ میں ضمنی نوعیت کا کام سمجھا۔

یہ اسی فکری نقص کا نتیجہ ہے کہ معاشرہ، اسلامی تحریکوں اور انقلابی تحریکوں کے ساری جدوجہد کے باوجود اس کے ثمرات سے محروم ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس سے متاثر افراد مسلم ریاستوں کے خلاف خروج کی راہ پر گامزن ہونے لگے ہیں۔

اگرچہ مسلم ریاستوں کے خلاف خروج کا ایک اہم سبب عالمی استعمار کی سازشوں کے خلاف ردعمل کی نفسیات بھی ہے، تاہم بہرحال سو سوا سو سال کے تجربات سے فائدہ اٹھاکر، اسلامی وانقلابی تحریکوں کو صحیح رخ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ وہ رخ یہی ہے کہ قیادت وکارکنوں کی اصلاح نفس کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دی جائے، اس کے لئے ذکر وفکر کو ترجیح دی جائے، دوم یہ کہ معاشرہ کی اسلامی تشکیل نو کے کام کو دوسرے نمبر پر

فیصلہ کن اہمیت دی جائے، معاشرہ میں سماجی خدمت کے اداروں کا جال پھیلایا جائے۔

تیسرے نمبر پر ریاستی سطح پر غلبہ دین کے کام پر زور دیا جائے۔ جب تک ابتدائی نوعیت کے یہ کام مؤثر طور پر نہیں ہوتے، تب تک آخری مرحلہ کے کام میں قابل ذکر صورت پیدا ہوجائے، ممکن نہیں، سلف کے تجربات بھی یہی ہیں تو سو سوا سو سال کی اسلامی تحریکوں کے اپنے تجربات ومشاہدات بھی یہی ہیں۔ ان تجربات ومشاہدات سے سیکھکر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید دور کے اسلامی مفکروں کی اسلامی فکر کی نصب العینی ترتیب میں غلطی ہوئی ہے۔ جو چیز اسلامی نقطہ نگاہ سے ترتیب میں پہلی جگہ پر آنی چاہئے تھی، یعنی افراد کے تزکیہ اور تہذیب نفس کا کام، اس کو آخری جگہ پر رکھا گیا ہے، بلکہ اسے افراد کے اختیاری فعل کی حیثیت دی گئی ہے، جب کہ غلبہ دین کا کام جو ابتدائی کاموں کا لازمی نتیجہ ہے، اسے نصب العینی اہمیت دے کر، دین کے سارے کاموں کا محور اسی کام کو قرار دیا گیا ہے، ہماری نظر میں اس دور میں علامہ اقبال، ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی فکر ہی متوازن فکر ہے۔ ان تینوں مفکروں کی فکر کی روشنی میں ہی ہم افراد معاشرہ کو داخلی وخارجی کفر کے مقابلہ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کر سکتے ہیں، دوسرے مفکروں کی فکر میں وہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ اس سے متوازن اسلامی فکر وعمل کے حامل افراد تیار ہوسکیں۔ **(ماخوذ: بیداری مارچ ۲۰۱۶)**

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب ہمارے ملک کے ان دوچار دانشوروں میں شامل ہیں، جو مغربی فکر پر پوری طرح دسترس رکھتے ہیں، اور اس فکر اور اس کی تہذیب کی خطرناکیوں کو اجاگر کرنے اور اس کے مقابلے کے لئے اسلامی تہذیب کی برتری اور اسلامی انقلاب کے لئے کام کا پورا خاکہ ذہن میں رکھتے ہیں اور اسے پیش کرتے رہتے ہیں۔

موصوف نے آج سے لگ بھگ ۳۰ سال پہلے مغربی فکر کے مطالعہ اور اس کے فہم اور جدیدیت کے سارے پہلوں پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جو روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں شایع ہوا تھا، جسے بعد میں ''ہم قدم'' رسالہ نے اپنے ایک خاص نمبر کی زینت بنایا تھا۔

ڈاکٹر انصاری صاحب، سرمایہ دارانہ نظام کے انسانی زندگی پر اثرات اور انسان کی معیشت اور اس کے طرز زندگی پر اس نظام کے پڑنے والے سایے اور پوری انسانیت کو اپنی جکڑبندیوں میں کسنے کے سلسلہ میں اس نظام کے علمبرداروں کی حکمت عملی جیسے موضوعات پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، ان موضوعات پر ان کی کاوشوں سے ایک دو اعلیٰ درجہ کی علمی وفکری کتابیں بھی شایع ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام پر بھی فکر انگیز گفتگو کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی زیرنگرانی ماہانہ ایک تقریب بھی منعقد ہوتی رہی ہے، جس میں ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم شریک ہوتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کوشش رہی ہے کہ ذہین عالم دین، انسانی معیشت اور ساری انسانی زندگی پر سرمایہ داری نظام کے پڑنے والے اثرات کو سمجھیں، تاکہ وہ اسلامی نظام

کی پیشکش کے سلسلہ میں سرمایہ نظام کے اثرات سے بچ سکیں، کہیں وہ اس نظام کی ہمہ گیر گرفت سے مرعوب یا متاثر ہوکر اسلام کے معاشی نظام کی پیشکش میں اس نظام کا چربہ نہ پیش کریں، اس سلسلہ میں ان کی فکرمندی واضطراب قابل قدر ہے اور متعدد علمائے کرام ان کی علمی نشستوں میں شریک ہوکر ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔

لیکن ہماری نظر میں اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کی فکر کے بعض پہلو ایسے ہیں جو ظالمانہ سرمایہ داری نظام اور مغربی تہذیب کی مادہ پرستی کا ردعمل ہیں، ان کی شخصیت میں یہ ردعمل پیدا ہونے کا سبب کارل مارکس پر ہونے والا ان کا تحقیقی کام ہے، موصوف نے کارل مارکس پر برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی ہے، چونکہ کارل مارکس اس نظام کے شدید ردعمل کا شکار تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے سرے سے انفرادی ملکیت ہی کا انکار کیا اور کمیونزم کی بنیاد میں نیشنلائیزیشن کو شامل کیا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب، سرمایہ دارنہ نظام کی کمزوریوں کی پیشکش کے معاملہ میں کارل مارکس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مارکس اور مارکسزم کے مطالعہ نے ڈاکٹر صاحب میں ایک اور چیز جو شامل کی، وہ سرمایہ داری نظام کے خلاف بغاوت کے جذبات تھے، چونکہ ڈاکٹر صاحب کی تربیت اسلامی فکر کی بنیاد پر ہوئی تھی، موصوف مولانا مودودی کے زیر اثر اسلامی جمیعت طلبہ سے وابستہ رہے، پروفیسر خورشید احمد صاحب کے دور میں وہ اسلامی جمیعت طلبہ میں سرگرم عمل رہے، اس لئے موصوف نے اسلامی انقلاب کے فلسفہ کو اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی، جس سے اس عالمی نظام کے علمبرداروں اور اس کے مقامی حمایت کاروں اور ریاستی نظام سے وابستہ افراد کے خلاف جذبات پیدا ہوں، اس طرح ڈاکٹر صاحب نے اسلامی انقلاب کے لئے وہی حکمت عملی تجویز کی جو روس میں لینن اختیار کرچکے تھے۔

ہماری نظر میں ڈاکٹر صاحب کی فکر میں یہ نقص مارکسی فکر کی گہرائیوں میں جانے

کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فلسفہ کہ اسلامی نظام کا غلبہ جمہوریت سے نہیں ہوگا، بلکہ انقلابی طرز فکر وطرز عمل اور انقلابی حکمت عملی ہی سے ہوگا، یہ نقطہ نگاہ ایسا ہے، جو کسی بھی مسلم ریاست کی وحدت وسالمیت کے لئے نقصان دہ ہے، اگرچہ اسلامی نظام بذریعہ انقلاب کی فکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی دی تھی، لیکن ڈاکٹر موصوف نے انقلابی حکمت عملی کو آخری مرحلہ قرار دیا تھا، جب معاشرہ سے مطلوبہ مقدار میں اسلامی انقلاب کے حامل افراد تیار ہوں، عملی سیاست سے کنارہ کش ہونے اور قرآن کی تفہیم سے زندگیوں کو بدلنے کے کام نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی انقلابی فکر ریاست کو زیادہ نقصان پہچانے سے محفوظ رہی، یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ محترم ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے اپنی فکر کے فروغ کے لئے کوئی تنظیم اور جماعت تشکیل نہیں دی، وہ محض تحریروں اور تقریروں میں یہ فکر پیش کرتے رہے۔

موصوف کی طرف سے اس سلسلہ میں ''بیداری'' میں اشاعت کے لئے مضامین ملتے رہے، ان مضامین میں جماعت اسلامی پر یہ زور دیا گیا تھا کہ وہ جمہوریت کی بھول بھلیوں میں پھنسے کے بجائے تبدیلی کے لئے انقلابی طریق کار اختیار کرے، بیداری نے ان مضامین کی اشاعت سے معذرت ظاہر کی، سبب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے آخری دور سے امت میں خارجیوں کا ایک گروہ موجود ہے، جو اپنے ذاتی فہم سے قرآن سے ایک خاص مفہوم اور خاص نصب العین کو مسلط کرنے کے لئے کوشاں رہا ہے، جس کی وجہ سے امت میں تکفیری عمل جاری رہا، اور خارجیوں کی تشددپسندی کی وجہ سے امت کا وحدت کا نظام بری طرح متاثر رہا حضورﷺ نے قیامت تک خارجیوں کے موجود ہونے کی پیشن گوئی فرمائی ہے، اس دور میں جو افراد بھی سلف کے تسلسل سے ہٹ کر ذاتی علم ومطالعہ وذہانت سے قرآن کا خاص مفہوم یا خاص نصب العین متعین کرکے اس کو امت پر مسلط کرنے کے لئے کوشاں ہوں گے، وہ امت کی

وحدت کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی فکر کا ایک صحتمند پہلو یہ رہا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کے لئے صوفیائے کرام کی صحبتوں سے بھرپور استفادہ کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں، اور یہ نقطہ نگاہ پیش کرتے رہے ہیں کہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر کوئی بھی اسلامی تحریک اسلامی انقلاب کے سلسلہ میں پیش قدمی نہیں کرسکتی۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں خشک فلسفیانہ پہلو غالب ہے، اس لئے متوسط ذہن کے فرد کے لئے اسے سمجھنا مشکل ہے، اس مشکل کی وجہ سے بھی ڈاکٹر صاحب کی فکر کو درمیانی علمی حلقہ میں پذیرائی نہ مل سکی۔

ڈاکٹر انصاری صاحب سے کافی عرصہ ہوا، ان کے گھر پر ملاقات ہوئی تھی، اس وقت موصوف کا چہرہ سنت رسول سے خالی تھا، اب تو ماشاء اللہ بھرپور داڑھی سے سینہ چھپ گیا ہے، اس وقت ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ تصوف ہمارے خاندان کا حصہ رہا ہے، اور وہ مجھے ورثہ کے طور پر ملا ہے، لیکن میں نظری طور پر تصوف کا علمبردار ہوں، علمی طور پر تصوف کے اجزاء سے قاصر ہوں اور اس کا موقعہ ہی نہ مل سکا ہے۔

اصلاح نفس، تزکیہ نفس اور معاشرہ کی اسلامی تشکیل نو پر غیر معمولی زور دینے اور قبل از وقت ریاست کی تبدیلی کے کام کو ہاتھ میں نہ لینے جیسے موضوعات پر ہمارے مضامین پڑھکر، محترم ڈاکٹر موصوف کو ہمارے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ ہم اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبہ اسلام کے لئے ہونے والی جدوجہد کے مخالف ہیں، چنانچہ موصوف نے ''برھان'' لاہور کے ایک شمارے میں شایع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ اور محمد موسیٰ بھٹو ایسے تصوف کے علمبردار ہیں، جو حرکیت اور اسلامی ہلچل سے خالی ہے، اور باطل کی عالمی قوتوں سے رواداری کا حامل ہے۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمی ہے، ایسا ہرگز نہیں، ہم تو غلبہ اسلام کے لئے تدریج اور بہتر حکمت عملی کے آرزو مند ہیں، ورنہ غلبہ اسلام کے نام پر وہی کچھ ہوگا، جو اس وقت عالم اسلام میں داعش کی طرف سے ہورہا ہے، اس لئے کہ تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کی کاوشوں کے بغیر فرد وافراد میں بہیمیت کے اثرات موجود رہتے ہیں، قوت حاصل ہونے کے بعد یہ بہیمیت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ **(ماخوذ: بیداری مارچ ۲۰۱۶)**

مریم جمیلہ صاحبہ

مریم جمیلہ صاحبہ، امریکہ کی یہودی النسل خاتون تھی، ان کا اصل نام مارگریٹ مارکس تھا، وہ ۱۹۳۴ء میں نیو یارک میں پیدا ہوئی، اللہ نے ان کی فطرت سلیمہ کو قائم رکھا تھا۔ امریکہ کے مادر پدر آزاد ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ شراب قواب اور مخلوط مجلسوں جیسی خرابیوں سے محفوظ تھی۔ کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں ان کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ وہ سکولی وکالیجی تعلیم کے بعد اکثر لائبریری میں وقت گذارتی تھی۔ توحید اور حق وصداقت کی طلب نے انہیں مولانا مودودی کی کتابوں تک پہنچایا، اس کے بعد امریکہ سے ہی ان کی مولانا مودودی سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ خط وکتابت کتابی صورت میں شایع ہوئی ہے، جس سے عہد جوانی میں ہی ان کی ذہانت، وسعت مطالعہ، مغربی تہذیب کی خرابیوں کے ادراک، اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات میں موجود انسانیت کی بھلائی ونجات کے پہلوؤں پر ان کے شعور وادراک کا اندازہ ہوتا ہے۔

مریم جمیلہ صاحبہ اسلام سے محبت کی وجہ سے اپنے وطن کو چھوڑ کر ۱۹۶۲ء میں پاکستان تشریف لائی۔ کچھ دنوں وہ مولانا مودودی کے گھر میں رہیں۔ بعد ازاں جماعت اسلامی کے کارکن محمد یوسف خان صاحب سے ان کی شادی ہوئی، یوسف صاحب کی یہ دوسری شادی تھی۔ مریم جمیلہ کی سیرت کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ زندگی بھر اپنی سوکن کے ساتھ بڑی محبت سے رہیں، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے موت کے وقت وصیت کی تھی کہ انہیں ان کی ''سوکن'' محترم شفیقہ کے قریب مدفون کیا جائے۔

مریم جمیلہ صاحبہ نے مغربی تہذیب کی پیدا کردہ خرابیوں کی نشاندہی اور اہل مغرب کو اسلام کے آفاقی اور انسانیت نواز تعلیم سے آشنا کرنے کے لئے انگریزی میں

درجنوں کتابیں لکھیں، ان کا یہ کام ایسا ہے، جو انہیں اسلامی دنیا کے ممتاز فضلا میں شمار کرتا ہے۔

مولانا مودودی کے ساتھ مریم جمیلہ کے خطوط کے مجموعہ پر مشتمل کتاب کا اردو ترجمہ ہمارے دوست ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب نے تین چار سال پہلے کیا تھا، ''بیداری'' میں تبصرہ کے لئے موصوف نے یہ کتاب ہمیں روانہ کی تھی، اس کتاب کے اہم ابواب اپنے تفصیلی تبصرہ کے ساتھ ''بیداری'' میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن درمیاں میں ایسے کام نکلتے گئے کہ یہ کام رہ گیا۔

اس کتاب کے مطالعہ سے میں مریم جمیلہ صاحبہ کے وسعت مطالعہ اور اسلام پر ان کے یقین سے بہت متاثر ہوا۔ تاہم میں نے انہیں تفصیلی خط لکھا، جس میں میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کے مطالعہ نے انہیں تصوف واہل تصوف کے سلسلہ میں کس نتیجہ تک پہنچایا ہے۔ کیا وہ اب بھی تصوف کے سلسلہ میں سرد مہری کا شکار ہیں یا اسے خلاف اسلام سمجھتی ہیں یا افراد معاشرہ کی تعمیر میں اس کے کردار کو ضروری سمجھتی ہیں۔ میں نے انہیں یہ خط ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کی معرفت ارسال کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اطلاع دی تھی کہ آپ کا خط ان تک پہنچ گیا ہے، لیکن موصوفہ نے خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کی مصروفیات حائل ہوں، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تصوف کے معاملہ میں الجھنا نہ چاہتی ہوں۔

مریم جمیلہ صاحبہ نے ایک بار امریکہ کو چھوڑا تو اس کے بعد انہوں نے مادہ پرست امریکہ کی واپسی کا سوچا تک نہیں۔ حالانکہ ان کے شوہر انہیں کہتے رہے کہ وہ والدین اور عزیزوں سے مل کر آئیں۔ ان کے دعوتی جذبے اور حمیت دین کا اندازہ ان کے اس تفصیلی خط سے لگایا جا سکتا ہے، جو انہوں نے اپنے والدین کو مغربی معاشرہ کی بڑھتی ہوئی خباثتوں کی نشاندہی اور توحید اور اسلام کی آغوش میں پناہ لینے کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ یہ بڑا ایمان افروز خط ہے۔

اس خط کے اہم حصے ہم ''ترجمان القرآن'' لاہور کے (جنوری ۲۰۱۳ء) کے شکریے کے ساتھ شامل کر رہے ہیں۔

مریم جمیلہ صاحبہ لکھتی ہیں: ''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ معاشرہ جس میں آپ کی پرورش ہوئی ہے اور جس میں آپ نے اپنی پوری زندگی گزار دی ہے، بڑی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور مکمل تباہی کے قریب ہے۔ درحقیقت ہماری تہذیب کا زوال بھی جنگِ عظیم کے وقت ہی ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا، لیکن دانشوروں اور ماہرین عمرانیات کے سوا کسی کو احساس نہیں ہوا کہ کیا ہورہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد اور خاص طور پر پچھلے دوعشروں میں یہ اتنی تیزی سے زوال کے اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ کوئی شخص اسے مزید نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

''زندگی کے معاملات اور رویوں میں کسی قابلِ احترام اور قابلِ قبول معیار کے نہ ہونے کی وجہ سے اخلاقی بے راہ روی، تفریحی ذرائع ابلاغ پر مبنی کج روی، بوڑھوں سے ناروا سلوک، طلاق کی روز افزوں شرح جو اتنی بڑھ چکی ہے کہ نئی نسل کے لیے پایدار اور خوش گوار ازدواجی زندگی ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ معصوم بچوں کے ساتھ غلط کاریاں، فطری ماحول کی تباہی، نایاب اور قیمتی وسائل کا بے محابا ضیاع، امراضِ خبیثہ اور ذہنی بیماریوں کی وبائیں، منشیات کی لت، شراب نوشی، خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان، جرائم، لوٹ مار، حکومتی اداروں میں بے ایمانی اور قانون کا عدم احترام ان تمام خرابیوں کی ایک ہی وجہ ہے۔

''اور وہ وجہ ہے لامذہبیت اور مادیت پر مبنی نظام کی ناکامی .....، نیک مارروائی، اعلیٰ وارفع مذہبی نظام سے دوری اور اخلاقی قدروں کا ناپیدا ہونا ..... اعمال کا دارومدار عقیدوں پر ہوتا ہے، کیونکہ نیت ہی درست نہ ہو تو عمل ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔''

''اگر زندگی ایک سفر ہے تو کیا یہ حماقت نہیں ہوگی کہ بندہ راستے میں آنے والی منزلوں پر آرام دہ ایام اور خوش گوار ٹھکانوں کی فکر تو کرے، لیکن سفر کے اختتام کے بارے میں کچھ نہ سوچے؟ آخر ہم کیوں پیدا ہوئے تھے؟ اس زندگی کا کیا مطلب ہے؟ کیا مقصد ہے؟ آخر ہمیں مرنا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ موت کے بعد کیا معاملہ ہونا ہے؟

''ابو! آپ نے ایک سے زائد بار مجھے بتایا ہے کہ آپ کسی روایتی مذہب کو اس

لیے قبول نہیں سکتے، کیونکہ آپ کو یقین ہے کہ الہامی مذہب، سائنس جدید سائنس سے متضاد چیز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے ہمیں ساری دنیا کے بارے میں بہت معلومات فراہم کی ہیں، ہمیں آرام وآسایشات اور سہولتیں فراہم کی ہیں، اس نے ہماری کارکردگی میں اضافہ کیا ہے اور ان بیماریوں کے علاج دریافت کیے ہیں، جو جان لیوا ثابت ہوتی تھیں، لیکن سائنس ہمیں یہ نہیں بتاتی اور نہیں بتا سکتی کہ زندگی اور موت کا کیا مطلب ہے۔ سائنس ہمیں، کیا اور کیسے، کا جواب تو دیتی ہے، لیکن 'کیوں' کے سوال کا کبھی کوئی جواب نہیں دیتی۔ کیا سائنس کبھی یہ بتا سکتی ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط؟ کیا نیکی ہے، کیا برائی؟ کیا خوب صورت ہے اور کیا بدصورت؟ ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس کے لیے کس کو جواب دہ ہیں؟ مذہب ان سارے سوالوں کے جواب دیتا ہے۔

''آج امریکا کئی لحاظ سے قدیم روم کے زوال وشکست کے آخری مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ سوچ اور فکر رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ لامذہبیت ہمارے معاشرتی نظام کی مستحکم بنیاد ثابت نہیں ہوسکی۔ وہ مضطرب ہو کر مختلف سمتوں میں اس بحران کا حل تلاش کررہے ہیں، لیکن انہیں ابھی تک نہیں پتا کہ یہ حل انہیں کہاں سے ملے گا۔ یہ تشویش چند ماہرین عمرانیات تک محدود نہیں ہے۔ قومی یک جہتی کی ٹوٹ پھوٹ کی بیماری براہِ راست آپ کو، مجھے اور ہم میں سے ہر ایک کو متاثر کررہی ہے۔

''آج امریکی باشندے، جوان ہوں یا بوڑھے بڑی تندہی سے رہنمائی کی تلاش میں ہیں۔ تلخ تجربوں کے بعد انہیں پتا چلا ہے کہ زندگی کے کسی مقصد اور صراطِ مستقیم کی طرف قابلِ اعتماد رہنمائی کے بغیر شخصی آزادیاں اور وہ ساری سہولتیں جو امریکیوں کو حاصل ہیں، لایعنی اور اپنی ذات کی تباہی کے مترادف ہیں۔ سیکولرازم اور مادیت امریکیوں کو ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کسی طرح کی مثبت اور تعمیری، اخلاقی قدریں فراہم نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت اور صہیونیت کے ہاتھوں ناکامی کے بعد امریکا میں زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہورہے ہیں۔ نومسلم، اسلام میں ایک پاکیزہ، صحت مند، صاف ستھری اور دیانت دار زندگی کا سراغ پاتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک موت سے ہر چیز ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ وہ اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ رہنے والی نعمتوں، پایدار ذہنی سکون اور دائمی خوشیوں کی توقع رکھتے ہیں۔''

''قرآن مقدس اور رسول خدا محمد ﷺ کی مستند احادیث میں پائی جانے والی یہ ہدایت ورہنمائی صدیوں سے مشرق کے دُورافتادہ علاقوں کی نسلوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ آج مغرب کو جو معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی مسائل درپیش ہیں، ان کا حل بھی ہدایت کے انہی سرچشموں میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں اسلام میں سردمہری، خالق سے دوری یا خالق سے بے نیازی کے احساسات نہیں پاتے جاتے۔ مسلمان ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے ہیں، جس میں اپنائیت ہے۔ جس نے نہ صرف اس کائنات کو پیدا کیا، بلکہ وہ اس کے نظم ونسق کا بھی ذمہ دار ہے اور وہی اس کا حکمران ہے۔ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کا بہت خیال رکھتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ ہم سب سے ہر ایک کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔''

''آپ دونوں کافی طویل عمر پا چکے ہیں اور بہت کم مہلت باقی رہ گئی ہے۔ اگر آپ فوراً عمل کریں تو زیادہ تاخیر نہیں ہوگی۔ اگر آپ کا فیصلہ مثبت ہوتو پاکستان میں اپنے پیارے لوگوں سے آپ کا نہ صرف خونی رشتہ ہوگا، بلکہ ایمان کا رشتہ بھی قائم ہوجائے گا۔ آپ نہ صرف اس دنیا میں ان سے محبت کرسکیں گے، بلکہ ہمیشہ رہنے والی زندگی میں بھی آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔

''میں ایک بیٹی کی حیثیت سے، جسے آپ سے محبت ہے، آخر وقت تک چاہوں گی کہ آپ اس بُرے نصیب سے بچ جائیں، لیکن فیصلہ صرف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو مکمل اختیار ہے کہ آپ اس دعوت کو قبول کریں یا مسترد کردیں۔ آپ کے مستقبل کا انحصار اس انتخاب پر ہے جو آپ نے اب کرنا ہے۔

اپنی ساری محبتوں اور نیک خواہشات کے ساتھ۔

آپ کی وفادار بیٹی، مریم جمیلہ۔'' (امریکا سے ہجرت، ص۲۰۔۲۵) **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' فروری ۲۰۱۳ء)**

نبی احمد لودھی

محترم نبی احمد لودھی صاحب ۱۸ اپریل کو راولپنڈی میں انتقال فرما گئے، **اناللہ وانا الیہ راجعون.**

موصوف، صاحب دل شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں ''خلافت ختم المرسلین ﷺ کی روحانی ومادی جہتیں'' کے نام سے ان کی کتاب کافی مقبول ہوئی اور جدید طبقات کو تصوف سے متعارف کرانے اور جدید اسلامی فکر کی کمزوریوں کو واضح کرنے کے سلسلہ میں اہم نوعیت کی کتاب ہے، جو ساڑھے نو سو صفحات کے لگ بھگ ہے۔

لودھی صاحب کی ذہنی نشو ونما جماعت اسلامی کے ماحول میں ہوئی تھی، وہ اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان کے رکن رہے۔ ۱۹۵۴ء کی ختم نبوت تحریک میں آٹھ ماہ تک گرفتار بھی ہوئے، اس وقت اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان کے ناظم اعلی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ان سے اس وقت سے کافی گہرے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے تھے۔

محترم لودھی صاحب ایک زمانہ میں جماعت اسلامی کے روزنامہ تسنیم کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کی شخصیت میں بہت سارے مدوجزر آتے رہے، جس سے وہ نئے نئے تجربات ومشاہدات سے گذرے۔ فکر مودودی کے بعد انہیں بیک وقت چشتی سلسلہ کے ایک بزرگ کی صحبت حاصل ہوئی، یہ صحبت کیا حاصل ہوئی کہ دل بدل گیا اور وہ تصوف ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ان بزرگ کی طرف سے ڈھائی سال کی صحبت کے دوران انہیں خلافت بھی حاصل ہوئی۔

موصوف مرکزی حکومت میں محکمہ خزانہ کے ڈپٹی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور اسی عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

مطالعہ، لودھی صاحب کی زندگی کا ایسا حصہ ہوگیا تھا کہ کھانا پینا تو چھوٹ سکتا

ہے لیکن روزانہ کے مطالعہ میں تعطل نہیں آ سکتا۔

''بیداری'' کے ساتھ خصوصی تعلق تھا۔ اکثر یہ ہوتا کہ بیداری میں جو مضامین ان کی طبیعت سے مناسبت نہ رکھتے، ان کے بارے میں موصوف ٹیلیفون کے ذریعہ اپنا تاثر بیان فرماتے اور تفصیل سے تنقید فرما کر، ہمارے مضمون کی کمزوریوں کو اجاگر فرماتے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے پرانے گہرے تعلق کی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب، تصوف واہل تصوف کے پیام اور دل کی تبدیلی کے سلسلہ میں ان کے احساسات کو سمجھیں اور ایسے اسلامی فکر، جس کی سلف سے تائید وتوثیق نہیں ہوتی، اس سے دستبرداری اختیار فرمائیں، اس سلسلہ میں انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کافی طویل خطوط لکھے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ وہ خطوط پڑھنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ بلکہ یہ فرمایا کہ آپ ان خطوط کو کتابی صورت میں شائع کریں گے تو پھر پڑھوں گا۔ لودھی صاحب نے یہ خطوط کتابی صورت میں ''جدید فکر اسلامی'' کے نام سے طبع فرما کر چند کاپیاں محترم ڈاکٹر صاحب کو ارسال کیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو پڑھنے سے انکار کیا۔ دونوں شخصیتوں کے ایک دوسرے سے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ لودھی صاحب لاہور جاتے تو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہاں قیام فرماتے اور ڈاکٹر صاحب راولپنڈی جاتے تو محترم لودھی صاحب سے ملاقات کے لئے ضرور حاضری دیتے۔ اس کتاب کی اشاعت سے کچھ پہلے سے تعلقات میں دوری پیدا ہوگئی۔

محترم نبی احمد لودھی صاحب نے یہ کتاب راقم الحروف کو بھی ارسال کی۔ ان سطور کے راقم نے لودھی صاحب کو تفصیلی خط لکھا کہ ڈاکٹر صاحب جیسی خدمت اسلام کا کام کرنے والی شخصیت کے خلاف کتاب لکھنا اور سخت لب ولہجہ اختیار کرنا، یہ آپ جیسی بزرگ اور صاحب دل شخصیت کے شان کے منافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ایسے حلقہ کو اسلام کے قریب لارہے ہیں، جس حلقہ تک آپ کی، ہماری اور علماء کرام کی رسائی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے نوجوانوں میں گویا ہمارا ہی کام کررہے ہیں، انہیں اپنے دائرہ کا میں کام کرنے کا موقعہ دینا چاہئے، البتہ ان کی فکر کی کمزوریوں کو محبت

وردردمندی کے ساتھ سامنے لانا چاہئے۔

یہ خط ''بیداری'' میں بھی شائع ہوا، جس پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ہمارا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے ان کا دفاع کیا، ایک عدد خط کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کچھ اہم کتابوں کا سیٹ بھی ارسال کیا۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر راقم نے محترم ڈاکٹر صاحب کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں نفس کی غیرمعمولی قوت اور اس کی اصلاح کے لئے سلف صالحین کے تجربات سے بھرپور استفادہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور تنظیم اسلامی اور ان کی فکر میں اس سلسلہ میں جو کمی وکوتاہی ہے، اس کی بھرپور نشاندہی کی۔

یہ خط محترم ڈاکٹر صاحب کے دل پر دستک دینے میں ناکام ہوا اور محترم ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں نظام زندگی کی تبدیلی اور اصلاح نفس کے کام کو کم اہمیت دینے کے اپنے موقف کی وضاحت کی اور یہ بھی لکھا کہ اب اس سلسلہ کو بند کریں۔

اس طرح ہم نے اس سلسلہ کو آگے بڑھا کر مزید تلخیاں پیدا نہ ہونے دیں۔ لیکن محترم نبی احمد لودھی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے اس خط میں ایسی لغزشیں نظر آئیں، جس کا جواب دینا، انہوں نے انتہائی ضروری محسوس کیا، موصوف نے پچاس ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک خط نما مضمون کمپوزنگ کراکر، بٹر کی صورت میں ہمیں ارسال کیا اور اسے شایع کرنے کا تاکیدی خط لکھا۔

ہم نے دوستوں کی مشاورت کے بعد اس مضمون کی عدم اشاعت کا فیصلہ کیا اور اپنے فیصلہ سے موصوف کو مطلع بھی کیا۔ اس کے بعد لودھی صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی فکر پر ایک دوسری ضخیم کتاب ''جاگتے لمحوں کی آواز'' کے نام سے تیار کی، جس میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہماری ساری خط وکتابت، اس سلسلہ میں محترم لودھی صاحب سے ہماری مراسلت اور دوسری بہت ساری چیزیں شامل کر دی۔

موصوف نے محبت کا اظہار فرماتے ہوئے اس کتاب کا انتساب اس عاجز کے نام کر دیا۔ اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ محمد موسیٰ بھٹو صاحب حکمت عملی کے نام پر اس بحث کو تکمیل پہنچانے کی بجائے درمیاں میں ہی راہ فرار اختیار کر گئے۔

اب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور محترم لودھی صاحب دونوں اس دنیا میں نہ رہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انہیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔

مراقبہ کے موضوع پر ہماری کتاب سامنے آئی تو اس پر سب سے پہلا تفصیلی تاثر محترم نبی احمد لودھی صاحب کا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مراقبہ کی افادیت اور زندگی پر اس کے اثرات کے حوالے سے کتاب میں جو بحث کی گئی ہے، وہ سب صحیح ہے۔ لیکن مراقبہ کیسے ہو؟ اس کی تفصیل کتاب میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تفصیل دینا ضروری تھی۔ راقم نے اس سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ آپ بہتر طور پر سمجھتے ہیں کہ طالب کو کتاب میں موجود الفاظ کے زیر وبم سکھانے کا سلیقہ استاد ہی سکھاتا ہے۔ کتاب استاد کا بدل ہو سکے، ممکن نہیں۔

اگرچہ چشتی سلسلہ میں بھی اسم ذات کا قلبی ذکر موجود ہے، لیکن اس سلسلہ میں بعض طالب صادق اسم ذات کے قلبی ذکر پر محنت نہیں کرتے، جس کی وجہ سے اسم ذات کے مراقبہ کے بارے میں ان کا مشاہداتی علم نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اور انہیں اسم ذات کے اثرات کا ادراک نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ اسم ذات کے ذکر ومراقبہ میں اگر اللہ کی ذات پر غور وفکر ہوتا ہے تو یہ تو حدیث کی رُو سے ممنوع ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسم ذات کے ذکر ومراقبہ میں اللہ کے انوار کی شعاؤں کو اخذ کرنے کی کاوش ہوتی ہے۔ جس سے زندگی میں ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ جس طرح سورج کے سامنے بیٹھے رہنے سے فرد میں حرارت بڑھ جاتی ہے اور فرد سراپا تپش ہوجاتا ہے، یہی صورت اسم ذات کے کثرت ذکر سے سالک کی ہوتی ہے کہ وہ محبوب حقیقی کی آتش عشق میں جلنے لگتا ہے۔

محترم نبی احمد لودھی صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات کی کافی طویل کہانی ہے۔ اور اس میں مدوجزر بھی آتے رہے۔ موصوف اہم مسائل پر (جو بیداری میں زیر بحث ہوتے تھے) ان کے بارے میں تفصیل سے اپنے موقف سے آگاہ کرتے تھے، جس سے راقم الحروف کو مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں سے آگاہی ہوتی تھی اور اس مسئلہ پر ازسرنو غور وفکر کی صورت پیدا ہوتی تھی۔ لودھی صاحب پچھلے کئی سالوں سے شگر، مثانہ

میں غدود اور دوسری کئی بیماریوں کے مریض تھے، لیکن ان کے مادی جسم پر روح غالب تھی، چنانچہ سخت عوارض کے باوجود وہ ٹیلیفوں پر ایک ایک گھنٹہ تک علمی موضوعات اور ملک کی تشویشناک صورتحال پر گفتگو فرماتے تھے۔

اس عاجز کو بعض اوقات اس بات پر کافی رنج ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں موجودہ دور کے بعض اچھے خاصے بزرگوں کی طرف سے متعدد معاملات میں کافی سخت رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلا اس دور کے کراچی ایک بڑے بزرگ، جس کے ہزاروں سے زیادہ مرید ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال کو نہ پڑھا جائے، اس لئے کہ وہ بے عمل شاعر تھے۔ یا محترم نبی احمد لودھی صاحب کی طرف سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شخصیت، فکر وحکمت عملی پر دو مفصل کتابیں لکھنا اور تیسری اور آخری کتاب میں سو سے زائد صفحات لکھنا، آخر اس کی توجیہ کیا ہوسکتی ہے؟ اس عاجز کی نظر میں اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ نگاہ میں پوری وسعت اور معاملہ کے سارے پہلو سامنے نہیں ہوتے۔ اگر معاملہ کے سارے پہلوؤں کا احاطہ ہوتو معتدلانہ موقف قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

محترم لودھی صاحب پچھلے کئی سالوں سے مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر پر ایک ضخیم تنقیدی کتاب لکھ رہے تھے، اس پر انہوں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ کتابیں جمع کر لی تھی، اس کتاب کو پوری طرح تحریری صورت دینے کی نوبت نہ آسکی، البتہ اس کتاب میں موجود مواد کا تفصیلی تعارف ان کی آخری کتاب میں موجود ہے۔

دوستوں اور ساتھیوں کا قافلہ تیزی سے طویل سفر کی طرف جارہا ہے، ساتھی ایک ایک کرکے منزل کی طرف گامزن ہیں۔ ہمیں بھی تیاری کی فکر دامنگیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائے۔ (آمین) **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' مئی ۲۰۱۳ء)**

ڈاکٹر خالد محمود سومرو

ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب کی شہادت سندھ، بلکہ ملک کے دینی حلقہ کے لئے ایک سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف مختلف صفات وصلاحیتوں کے مالک تھے۔

خالد محمود صاحب تعلیم کی تکمیل اور ہاؤس جاب کے بعد سرکاری ملازمت کے لئے کوشاں ہوئے، ایک دن انہیں سرکاری ملازمت کا آرڈر ملا، جس پر وہ بڑے خوش ہوئے اور اپنے والد صاحب کو یہ خوشخبری سنائی، مولانا علی محمد حقانی صاحب نے ان سے ملازمت کا یہ آرڈر لے کر، اسے پھاڑ دیا اور کہا کہ تمہیں تعلیم دلانے سے ہمارا مقصد سرکاری ملازمت کرکے، معاش کی جدوجہد میں زندگی خرچ کرنا نہیں تھا، بلکہ اس سے مقصد دین کی خدمت اور اس کی سربلندی کا کام کرنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے باقائدہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ درس نظامی کے کورس کی تکمیل کی تھی، انہوں نے سندھ میں جمعیۃ علمائے اسلام کو متحرک وفعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، سندھ کا شاید ہی کوئی قابل ذکر قصبہ ہو، جہاں جمعیت کی دعوتی وتنظیمی سرگرمیوں کے نقطہ نگاہ سے نہ گئے ہوں۔

سندھ میں دینی سیاسی جماعتوں میں وہ صوبائی سطح پر اس طرح ابھر کر سامنے آئے تھے کہ سندھی میڈیا کے لئے ان کے بیانات کو نظر انداز کرنا دشوار تھا۔ سندھی میڈیا، جس پر کمیونسٹ اور قوم پرست طبقات غالب ہیں، وہ حالات ومسائل میں مذہبی اور دینی نقطہ نگاہ کی اشاعت کے روادار ہی نہیں ہیں۔ میڈیا، ہر معاملہ میں سیکولر اور قوم پرست نقطہ نگاہ کو پیش کرنے، بلکہ اسے قارئین وسامعین پر مسلط کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب کے نقطہ نگاہ کو اس میڈیا کی طرف سے پیش ہونا، یہ موجودہ حالات میں دینی طبقات کی ایک بڑی کامیابی تھی۔

محترم ڈاکٹر خالد محمود صاحب کے بیانات وتقریروں میں سندھ کے مسائل پر بھی زور ہوتا تھا، جس کی وجہ سے ملکی سطح پر بعض اوقات محبّ اسلام افراد تکلیف محسوس کرتے

تھے اور اسے قومیت کے رجحان سے منسوب کرتے تھے۔ میرے خیال میں سندھ کے مخصوص حالات میں ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب کا سندھ کے مسائل کے بارے میں یہ نقطہ نگاہ زیادہ غلط نہ تھا۔ اگر سندھ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف تو وڈیرہ شاہی ہے، جو ہر دور میں صوبائی حکومت پر چھائی رہی ہے، اس نے سندھ کے سارے اداروں کو تباہی کے دہانے پہنچا دیا ہے، دوسری طرف مرکزی حکومت کی سول اور فوجی نوکر شاہی کے تسلط اور اس کی پالیسیوں کی وجہ سے ہر دور میں مقامی افراد سے زیادتیاں ہوتی رہی ہیں۔ زرعی زمینوں سے لے کر دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم تک کے سارے معاملات میں سندھ واہل سندھ زیادتی کا شکار رہے ہیں۔ انہی مسائل کو بنیاد بنا کر کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کو سندھ کی نسلوں کو اسلام اور پاکستان کے خلاف ذہن بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ان خاص حالات میں محترم خالد محمود صاحب کا سندھ کے مسائل پر آواز بلند کرنا، ایک اعتبار سے ضروری بھی تھا۔

ڈاکٹر خالد محمود صاحب عالم دین ہونے کی حیثیت سے مدرسہ میں باقائدہ درس نظامی کی کتابیں بھی پڑھاتے تھے، کتابیں پڑھانے کا انہیں خاص ذوق حاصل تھا، وہ حدیث وتفسیر پڑھاتے تھے۔ سیاسی مصروفیات کی گہما گہمی میں دینی علوم سے یہ ذوق ایک خداداد صلاحیت تھی، جو انہیں حاصل تھی، ان کے والد مولانا علی محمد حقانی صاحب پر اللہ کا یہ بڑا فیضان تھا کہ ان کے دوفرزند دینی علوم اور دینی خدمت سے ایسے وابستہ رہے کہ یہ کام ان کی زندگی کا ہدف بن گیا۔ ایک ڈاکٹر خالد محمود صاحب، دوسرے مولانا مسعود احمد سومرو صاحب، مولانا مسعود احمد سومرو صاحب نے سینکڑوں علماء کرام تیار کئے ہیں۔ موصوف کی بڑی خوبی درویشی ہے، جس میں وہ ممتاز ہیں۔ دین کے لئے فکرمندی، حمیت دین، وسعت فکری اور ہر مکتبہ فکر سے رواداری کے معاملہ میں بھی ان کی شخصیت دوسرے علماء کے لئے قابل تقلید ہے۔

محترم ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فرزند راشد محمود سومرو صاحب کی علمی اور ذہنی طور پر تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انہیں عالم بنایا، جدید علوم سے بھی بہرہ ور کیا۔ تقریری وتحریری صلاحیت اور تنظیمی

استعداد کا حامل بنایا۔ چنانچہ ان کے فرزند راشد محمود سومرو صاحب ان کے خال کو ان شاء اللہ ایک حد تک پُر کرسکیں گے۔ مدرسہ کے نظام کو تو وہ پہلے سے چلا رہے ہیں، دوسرے محاذوں پر بھی بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں۔

محترم خالد محمود سومرو صاحب نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ مجھے حضرت مولانا عبدالکریمؒ بیر والوں نے فرمایا تھا کہ جی ایم سید سے ملاقات کرکے، سندھ کے حوالے سے ان کا پروگرام معلوم کرو، اس طرح اسلام کے موضوع پر بھی ان کے خیالات معلوم ہوں گے۔

بتایا تھا کہ میں سن گیا، سائیں جی ایم سید صاحب کی مجلس چل رہی تھی، میرا تعارف ہوا، خیروعافیت کے بعد گفتگو پھر سے شروع ہوئی۔ جی ایم سید صاحب نے گفتگو میں اسلام کی ایک ایک چیز کی مخالفت کی۔ کہا کہ دنیا میں فساد کا بڑا سبب اسلام کا جہاد کا تصور ہے۔ اس کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو دنیا پر عرب سامراج کو مسلط کرنے کا موقعہ ملا۔ خالد صاحب نے بتایا کہ میں پہلی بار جی ایم سید صاحب کے ان عقائد سے آشنا ہوا، جس سے مجھے شدید اذیت ہوئی، واپس آکر میں نے حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؒ کو جی ایم سید کی ساری گفتگو بتائی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ تو بالکل ملحدانہ عقائد ہیں۔

ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب نے اپنے مدرسہ ''اشاعتہ القرآن والحدیث کو اندرون سندھ کا سب سے بڑا مدرسہ بنا لیا تھا، اس میں ان کی غیرمعمولی جدوجہد کو عمل دخل تھا۔ اس مدرسہ سے وابستہ دوسرے کئی مدارس تھے، جو ان کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ موصوف نے مدرسہ کی طرف سے سندھی زبان میں دینی وفقہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ انہوں نے اپنے والد صاحب کی کئی کتابیں شائع کیں۔ کئی سالوں سے موصوف مدرسہ کی طرف سے سندھی زبان میں ایک ہامانہ رسالہ بھی شائع کرتے تھے، چونکہ مجھے رسالہ کا کوئی شمارہ نہ مل سکا، اس لئے سندھ کے حالات میں اس رسالہ کے مزاج اور پالیسی کے بارے میں تبصرہ نہیں کرسکتا۔

خالد محمود سومرو صاحب کی شہادت کو کراچی میں اب تک شہید ہونے والے

سینکڑوں علماء کی شہادت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری کارستانی عالمی شاہوکار کی ہے، جس کے سامنے حکومت بے بس ہے، عالمی شاہوکار کی چاہت یہ ہے کہ پاکستان جیسے مذہبی ملک میں لوگوں کو دینی اعتبار سے متحرک کرنے اور لوگوں میں نفوذ کرنے والی شخصیتوں کو راستے سے ہٹایا جائے، تاکہ مادیت کی بڑھتی ہوئی تحریک کی راہ میں حائل قوتوں کا خاتمہ ہو اور معاشرہ میں اخلاقی اقدار اور دینی شعائر سے وابستگی ختم ہو۔

راقم سطور نے ۲۰۰۰ء میں اپنی لکھی گئی کتاب ''جدید سندھ کے عالم ودانشور میں'' محترم خالد محمود سومرو صاحب کا بھی مختصر تعارفی خاکہ لکھا تھا، وہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ آخر میں میرے نام ان کے دو خطوط بھی ہیں۔ جو انہوں نے ابتدائی دور میں مجھے لکھے تھے۔

(۲)

ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب جمعیۃ علماء اسلام پاکستان سندھ کے لیڈر ہیں، موصوف نہایت ہمت اور جرأت کے صاحب ہیں، تقریریں، دورے، مسلسل سفر، اخباری بیانات، مخالفانِ اسلام کو چیلنج دینا، لوگوں کے سماجی کام کاج میں وقت صرف کرنا، یہ ان کی جدوجہد اور سرگرمیوں کا محور ہے۔ خالد محمود صاحب نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈاکٹری اختیار کرنے کی بجائے دینی خدمت کے کام کو زندگی کا نصب العین بنا کر، اپنی زندگی وقف کی، لاڑکانہ میں ان کے والد صاحب کا قائم کردہ مدرسہ ہے، جس کے وہ خود نگران اور مہتمم اعلیٰ ہیں۔ دارالعلوم کی طرف سے وہ دینی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ لاڑکانہ کے ایک خوشحال ہندو خاندان کے کچھ ہندو نوجوان مسلمان ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت اور جملہ اخراجات کا انتظام بھی وہ کرتے ہیں، اس طرح کافی کام ہیں، جو موصوف سرانجام دیتے ہیں۔

۱۹۸۴ء سے میری کوشش رہی ہے کہ سندھ میں مختلف دینی جماعتوں کے ذہین افراد سے ذاتی رابطے رکھ کر، ان سے مسلم امت کو درپیش چیلنج کے بارے میں تبادلہ

خیال کرکے، بالخصوص سندھ میں لادین فکر وتحریک کے خلاف کام میں دامے درمے سخنے تعاون حاصل ہو اور انہیں احساس دلایا جائے کہ مسلم امت آج عالمی کفر کے جس سنگین گھیرے میں ہے، اس سے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ دینی ادارے اور دینی شخصیتیں فروعی مسائل، باہمی اختلافی امور اور اجتماعی اور گروہی دائروں سے بلند ہو کر، امت کے وسیع تر مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی فکر میں وسعت اور بلندی پیدا کریں اور اپنے کارکنوں کی اس سلسلہ میں تربیت کریں۔

ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب سے بھی کافی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں جب بھی اپنے گاؤں جاتا تھا تو موصوف سے ملاقات کے لئے ضرور وقت نکالتا تھا۔

یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی کہ موصوف نے سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں تعاون فرمایا۔ آج موصوف جمعیت کے جس عہدے پر فائز ہیں، وہاں وہ بہتر کردار ادا کررہے ہیں، لیکن یہ کہے بغیر رہا نہیں جا سکتا کہ دینی سیاسی جماعتیں جب تک نظریاتی دائرے میں اپنے کام کو وسعت نہ دیں گی اور نئے دور کے نظریاتی چیلنج اور عالمی تہذیب کے خطرات کے فہم اور اس کے مقابلہ کے لئے جماعتی کارکنوں میں فکری شعور کے لئے بہتر نظام قائم نہ کریں گی اور اپنے کارکنوں کی دینی تربیت کا مستحکم نظام متشکل نہ کریں گی، اس وقت تک سیاسی جدوجہد کے قابل ذکر ثمرات حاصل ہونا مشکل ہیں۔ آج جب کہ سندھ میں جی ایم سید کی فکر اب تک طاقتور صورت میں موجود ہے اور سیکولرزم اور لبرلزم کے علمبردار بھی قوت کے ساتھ موجود ہیں، یہی فکر صحافت، ادب، تعلیم اور سیاست کے خطوط متعین کررہی ہے تو ایسی صورتحال میں سیاسی جدوجہد اور اخباری بیان بازی اور عالمی کفر کو چیلنج دینے والی تقریروں سے نہ تو سیاسی اور انقلابی تبدیلی کی راہ ہموار ہوسکتی ہے اور نہ ہی سندھ کے متوسط طبقہ کی فکر اور شعور کو اسلام کے ہمنوا بنایا جا سکتا ہے۔

دینی سیاسی جماعتوں کے کچھ افراد کا سندھ کی سطح پر ابھرنا اور اخبارات میں نمایاں حیثیت سے ان کے بیانات کی اشاعت نہایت خوشی کی بات ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرکے، خلا کو پُر کرنے کی

کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جدید سندھ کے نظریاتی حالات سے مطابقت رکھنے والے اسلامی فکر کے حامل ذہین نظریاتی افراد کی تیاری اور تربیت کے کام کو بھی اہمیت دینا ضروری ہے، سندھ کا یہ نظریاتی مسئلہ جب تک قابل ذکر حد تک حل نہیں ہوتا، اس وقت تک سیاسی جدوجہد والے دائرے میں پیش رفت بھی مشکل ہے۔

آخر میں ان کے دو خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

محترم جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب

السلام علیکم

عیدالضحیٰ کے موقعہ پر لاڑکانہ میں، میں نے آپ کو اپنا ایک مقالہ دیا تھا، ایک نظر ڈالنے اور اپنی رائے سے مطلع کرنے کیلئے، اس سلسلہ میں آپ کی رائے کا انتظار ہے۔ دوم آپ کو من الظلمات الی النور کتاب ارسال کرنے کے لئے عرض کیا تھا، اس کتاب کا سندھی ایڈیشن مطلوب ہے۔ جی ایم سید کی کتاب، دیار دل داستان محبت، اور سندھوء جی ساچاہ، کی فوٹو اسٹیٹ اور اس کے جواب پر مشتمل کتاب بھی ارسال کردیجئے گا۔

والسلام

خالد محمود

سندھ اسلامک مشن کے تحت، سندھ ماضی حال اور مستقبل، کے عنوان سے ۱۰ دسمبر ۱۹۸۷ء کو کراچی میں ہونے والے سیمینار کا دعوت نامہ ملا۔ میں اس میں شرکت کرکے خوشی محسوس کرتا اور احباب کے خیالات سے آگاہ ہوتا، لیکن چونکہ اسی دن سکھر میں حضرت سید محمد شاہ امروٹی رحمتہ اللہ کی جگہ پر کسی متبادل شخصیت کا انتخاب کرنا ہے، اس لئے شرکت سے معذور ہوں۔ اگر اس سیمینار سے متعلق کیسٹ تیار ہو یا کتابچہ شایع ہو تو اس سے استفادہ کا موقعہ ضرور فراہم کریں۔ **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' جنوری ۲۰۱۵ء)**

خالد محمود

سید ذاکر علی

سید ذاکر علی صاحب، جسارت کے پبلشر تھے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۴ء تک ان سے بیسیوں ملاقاتیں رہیں۔ انہیں جماعت اسلامی کا ولی انسان کہنا صحیح ہوگا، ملنساری، محبت، اپنائیت، صبر وتحمل، بُردباری، اپنوں اور غیروں سب سے والہانہ محبت، ان کے مزاج کا حصہ تھا، میں ۱۳ سال تک روزنامہ ''جسارت'' کے وقائع نگار خصوصی کی حیثیت سے کام کرتا رہا، ان دنوں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، ان دنوں میں جماعت اسلامی کی ایک ممتاز شخصیت کے رویے سے سخت شاکی تھا۔ محترم ذاکر صاحب کے سامنے سخت الفاظ میں اس کا اظہار ہوتا تھا، موصوف، میرے دلی جذبات کو بڑی وسعت قلبی سے سنتے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے مجھے نہ تو کبھی ٹوکا اور نہ ہی مجھے یہ احساس دلایا کہ تم ردعمل کا شکار ہو۔ بعد میں جب میرا اہل اللہ سے تعلق قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ تو میری خالص نفسی جذبات کی صورت تھی۔ اختلاف رائے کو اس شدت سے محسوس کرنا کہ اسے دشمنی تک پہنچانا، یہ فسادِ نفس ہی کا شاخسانہ ہے۔

سید ذاکر علی صاحب اُس دور میں اپنی روحانیت کی ایسی ایسی باتیں بتاتے تھے کہ ہمارا ذہن ماننے کے لئے تیار نہیں تھا، اور وہ گھنٹوں اپنے واقعات بتاتے تھے۔ مثلاً بتاتے تھے کہ میرے پاس ابدال آتا ہے ۔ جو ملاقات کے بعد تھوڑا آگے چل کر غائب ہوجاتا ہے۔

موصوف بتاتے تھے کہ وہ ابدال آنے والے حالات کے بارے میں بہت ساری پیشنگوئیاں کرتا تھا، جو بعد میں بڑی حد تک صحیح ثابت ہوتی تھیں، ایک بار بتایا تھا کہ میں نے ابدال سے پاکستان کی ایک فاضل شخصیت کے بارے میں پوچھا تھا کہ ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ وہ شخصیت دین کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہی ہے اور دور جدید کے علمی اور نظریاتی فتنوں کے شکار افراد کو اسلام کی طرف لانے میں مولانا فیصلہ کن کردار ادا کر رہی ہے۔

سید ذاکر علی صاحب کو جِنوں کے سحر کو توڑنے اور سفلی عملیات کے اثرات کے قلع قمعہ کا بھی فن حاصل تھا۔ موصوف، اسلامی دعوت کے فروغ کے کام کے لئے بڑے بڑے منصوبے بناتے تھے، سندھی زبان میں اخبار کی اشاعت کا منصوبہ بھی تھا۔ لیکن عملی طور پران کاموں میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہوسکی۔

۱۹۸۴ء کے بعد جماعت اسلامی کے بزرگوں اور دوستوں سے میرا رابطہ منقطع ہوگیا، کئی سالوں کے بعد کسی صاحب نے انہیں ہمارے ادارہ کی شائع کردہ سندھی اور اردو کتابیں دیں، اس پر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور کہا کہ جسارت میں لکھنے کا ملکہ کام آیا اور اب تم صحیح محاذ پر متحرک ہو گئے ہو۔

سید ذاکر علی صاحب جسارت کے پبلشر کی حیثیت سے ۱۹۷۳ء میں جسارت کی بندش کے بعد مدیر جسارت محمد صلاح الدین کے ساتھ جیل بھی گئے تھے، ان کی سب سے بڑی ادا یہ تھی کہ ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ نمایاں ہوتی تھی، وہ شرافت کا مجسمہ تھے، ان کے انتقال کی خبر سن کر دکھ ہوا کہ پچھلے ۲۵ سال میں ایسی نفیس شخصیت سے رابطہ وملاقات کی صورت کیوں پیدا نہ ہوسکی۔ **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' فروری ۲۰۱۳ء)**

ڈاکٹر محمد طاھر

ڈاکٹر محمد طاھر صاحب موجودہ مادیت پرستی کے دور کی ایسی شخصیت ہیں، جو جدید طبقات کے لئے ہر اعتبار سے مثالی ہیں، موصوف ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہیں۔ حکیم صابر ملتانی کے طریق علاج کے ماہر ہیں۔ بیماریوں کی تشخیص وعلاج کے سلسلہ میں اللہ نے انہیں ایسی صلاحیت عطا کی ہے، جو بہت کم ڈاکٹروں وحکیموں کو عطا ہوتی ہے۔ انہیں اکثر حالات میں مریضوں سے ٹیسٹوں اور رپوٹیں کرانے کی ضرورت ہی درپیش نہیں ہوتی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ صوفی ہیں، متوسط صوفی، جو محبوب کی راہ پر مسلسل چلتا رہتا ہے اور تھکنے کا نام ہی نہیں لیتا اور جس کی محبوب کے لئے طلبِ مسلسل بڑھتی ہی رہتی ہے۔

موصوف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ فقر کے اجزاء سے بہرہ ور ہیں اور دوسروں کے لئے بھی وہ فقر کی راہ ہی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ساتھ دور جدید کے نفسیاتی اور طبعیاتی علوم اور مغرب میں دو تین سو سال سے مادیت کے زیر اثر وجود میں آنے والے نظریات کے وسیع مطالعے کے حامل ہیں۔ اسلامی فکر پر کامل یقین کی وجہ سے وہ مغربی نظریات سے متاثر بڑے سے بڑے دانشور کو بھی دوستانہ ماحول میں مکالمہ کے ذریعہ ان نظریات کے سحر سے نکالنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہیں ذکر فکر کے مجاہدوں کی وجہ سے حکمت، فراست اور حقیقی فہم کی دولت عطا ہونا شروع ہوئی ہے۔ وہ بعض اوقات افراد اور معاشروں کے عروج وزوال اور نفسیات کے حوالے سے ایسے نکات بیان کرنے لگتے ہیں کہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ نکات ظاہری علوم کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ ان نکات میں جدیدت کے وسیع مطالعہ کے تناظر میں باطنی نوعیت کی رہنمائی شامل ہوتی

ہے۔ موصوف جب موجودہ سائنسی وٹیکنالوجی ترقی اور نئے علوم کے پس منظر میں اسلامی تصوف کی اہمیت او ر ذکر وصحبت اہل اللہ کی افادیت پر گفتگو کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادیت سے متاثر جدید انسان کی رہنمائی کے لئے ان سے یہ نکات بیان کروائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کو جو طبی صلاحیتیں حاصل ہیں، اس کی وجہ سے وہ آسانی سے کروڑپتی بن سکتے ہیں، اس لئے کہ بیماریوں کی تشخیص کے بعد علاج باالغذا کے ذریعہ ان کے ہاں بڑی سے بڑی بیماریوں کا فطری طریقہ علاج موجود ہے اور اس طریقہ علاج میں وہ ماہرانہ حیثیت رکھتے ہیں، فقر کے اجزاء کے غالب ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت پر فقر کا رنگ غالب ہے۔ ماہر ڈاکٹر، جو روزانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کماتے ہیں، ڈاکٹر موصوف غیر معمولی ماہرانہ صلاحیت اور مریضوں کی شفایابی کے باوجود خالی جیب رہتے ہیں، اس لئے کہ اول تو وہ مریضوں کو علاج باالغذا کے حوالے سے مفت مشورے دیتے ہیں، اگر دوا دیتے ہیں تو اس کے پیسے عام سے ہوتے ہیں۔ روزانہ حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی وہ رقم کا ایک معقول حصہ غریبوں پر خرچ کرتے ہیں۔ وہ غریبوں، بےکسوں اور مالی اعتبار سے محتاج افراد کی حالت دیکھ کر خون کے آنسو بہانے لگتے ہیں۔

اس عاجز سے ان کا تین چار سال سے گہرا تعلق قائم ہے، یہ عاجز ان کے مشوروں اور قیمتی نکات سے بھرپور استفادہ کرتا رہتا ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس عاجز کو پچھلے ۲۵ سال سے اعصابی ودماغی کمزوری، پیٹ کی خرابی اور بار بار پیشاب کی شکایت، پتہ میں پتھری جیسی جو شکایات تھی، ان ساری بیماریو ں میں جو فائدہ ڈاکٹر صاحب کے تجویزہ نسخوں اور علاج باالغذا سے ہوا، وہ کسی حکیم اور ڈاکٹر کے علاج سے نہیں ہوا، جب کہ یہ عاجز پچھلے پچیس سال تک مسلسل ڈاکٹروں وحکیموں کے زیر علاج رہا۔ لیکن بیماریوں کی صحیح تشخیص ہی نہ ہو پارہی تھی، ڈاکٹر صاحب نے نبض دیکھ کر جو تشخیص کی، وہ حیرت انگیز تھی، اس لئے کہ اب تک کوئی صحیح تشخیص نہ کر سکا تھا۔ حکیم عبدالطیف غوری صاحب کے چھوٹے بھائی حکیم مولانا اختر الزمان صاحب کا بیان کردہ

یہ نکتہ مجھے بالکل صحیح نظر آیا کہ موجودہ دور میں اگر حکیم صابر ملتانی کے طریقہ علاج کا صحیح ماہر نظر آئے تو اس کے علاج سے بڑی بڑی بیماریوں سے فضل خدا شفایابی ہوسکتی ہے۔ حکیم غوری صاحب ۲۵ سال سے برمنگھم (برطانیہ) میں مطب چلاتے ہیں (اور لڑکیوں کا ایک بڑا دینی مدرسہ بھی) کہتے ہیں کہ ایلوپیتھ کا طریقہ علاج بری طرح ناکام ہے، اس وقت بیماریوں کا سائنٹفک طریقہ علاج حکیم صابر ملتانی کے طریقہ علاج کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ ڈاکٹر طاہر صاحب اس طریقہ علاج کے بڑے ماہر ہیں، اس عاجز نے اپنے ساتھیوں و عزیزوں کا ان سے علاج کرایا، جن مریضوں نے بھی ان کے طریقہ علاج کے تحت دوا کے ساتھ علاج باالغذا پر عمل کیا، الحمداللہ تقریبا سب کو فائدہ ہوا۔ حالانکہ بعض مریض ڈاکٹروں کی رپوٹوں، ٹیسٹوں، ان کی فیسوں اور دوا پر لاکھوں روپے خرچ کر چکے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ مریض علاج بالغذا کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں، ۹۸ فیصد مریض پرہیز کے معاملہ میں غذائی عادت کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کے بعض خوشحال قریبی عزیز ان کی حالتِ فقر کو دیکھ کر دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ اتنا ذہین او رمتحرک فرد، جو غیر معمولی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا حامل ہے، وہ معاشی طور پر اتنی مضمحل حالت میں ہے کہ نہ اپنی کار ہے اور نہ ہی بنگلہ، سادہ مکان، سادہ لباس، وہ کہتے ہیں کہ اگر ڈاکٹر صاحب سرکاری ملازمت کرتے تو معاشی اعتبار سے کچھ نہ کچھ تو مستحکم ہوتے۔ ان بیچاروں کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ فقر خود اختیارانہ فقر ہے۔ یہ ایسا فقر ہے، جس پر ساری دنیا کا خزانہ قربان کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر صاحب جدید مفکروں اور جدید فاضل اسلامی شخصیتوں کے فکر اور ان کی دعوتی حکمت عملی اور دینی ومذہبی جماعتوں وتحریکوں کے کام کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دین کے بنیادی معاملات میں سلف صالحین پر اعتماد کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، اگر یہ اعتماد ختم ہوگیا، اپنے علم اور ذہانت سے فہم دین کا سلسلہ شروع ہوا تو مسلم معاشرہ کو تفرقات سے بچانا ممکن نہیں۔ اس وقت ہمارا

معاشرہ عملا اس صورتحال سے دوچار ہے۔

تصوف کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور کی بڑی خانقاہوں سے فقر محمدی کے اجزاء کا خاتمہ تصوف کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اصلاح نفس اور تزکیہ نفس کا یہی ادارہ ہمارے یہاں سلف کی میراث تھی۔ اس میراث کو بھی نظر بد لگ گئی اور مادیت کی طوفانی لہروں نے اس دور کی بڑی بڑی درگاہوں وخانقاہوں کو دولت کے اثرات سے ان کی افادیت وقدروقیمت کو زائل کردیا۔ اس لئے کہ جدید دور کا انسان دین وروحانیت کے وارثوں کو عقابی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ بڑے بڑے مالداروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بڑی بڑی خانقاہوں اور درگاہوں کے وارثوں کی معاشرت اور طرز معیشت میں کوئی فرق نہیں ہے تو وہ تصوف وروحانیت کے حقیقی وارثوں سے ہی بیزار ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کوئی عمر رسید شخصیت نہیں ہیں، بلکہ عمر بمشکل ۴۳ سال ہے۔

اللہ کرے جدید طبقات ان کی فقر کی زندہ اور مثالی زندگی کو دیکھ کر ان کے لئے دولت کی پرستش سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوسکے۔

ہمارے ایک نئے دوست جو جدید نفسیاتی مشقوں کے ذریعہ نفسیاتی مریضوں کا ادارہ چلاتے ہیں اور جدید طرز کی ان مشقوں اور کچھ مسلم علم نفسیات کے تجربات پر مشتمل ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ انہیں جدید نفسیات کے اس طریقہ علاج کے بہتر، مؤثر اور پائیدار ہونے کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی خوداعتمادی تھی، اس عاجز سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں تو انہوں نے تفصیل سے اس کا اظہار کیا، اس عاجز نے عرض کیا کہ جدید نوعیت کی نفسیاتی مشقوں سے یقیناً مریضوں کو وقتی طور پر فائدہ ہوتا ہوگا، لیکن انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو جس طرح مسلم علم نفسیات کے ماہروں نے سمجھا ہے، اس کی رُو سے انسان کے سارے جذبات کی تسکین اللہ کے ذکر اور صحبت اہل اللہ سے ہی ممکن ہے، ساری نفسیاتی بیماریاں محبوب حقیقی سے محبت کے جذبات کی عدم تسکین ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مغربی نفسیات، جب انسان کے سب سے طاقتور فطری داعیے یعنی محبوب حقیقی سے محبت کے داعیے ہی کو نہیں سمجھتی تو اسے افراد کی نفسیاتی بیماریوں کی صحیح تشخیص

اور اس کے صحیح علاج کا گُر حاصل ہوسکے، ممکن ہی نہیں۔ چونکہ موصوف نے اس موضوع پر مغربی لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور وہ عرصہ سے ان خطوط پر علمی وعملی طور پر کام بھی کر رہے ہیں اور ملک کے مختلف شہروں میں وہ اس موضوع پر لیکچر بھی دیتے ہیں، اس لئے انہیں اس طریقہ علاج پر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا۔اس عاجز نے عرض کیا کہ بھائی، اس موضوع پر میری نظر سے مغربی لٹریچر تو زیادہ نہیں گذرا، چند کتابیں پڑھی ہیں، لیکن آپ اگر مغربی نفسیات کے پس منظر میں مسلم نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ان کا تقابلی فہم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ ڈاکٹر محمد طاہر صاحب سے تفصیلی گفتگو کرسکتے ہیں۔ وہ آپ کو زیادہ بہتر طور پر مطمئن کرسکتے ہیں۔

موصوف نے ڈاکٹر صاحب سے موبائل پر تفصیلی گفتگو کی، کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک، اگلے روز انہوں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے وہ ساری مغربی کتابیں پڑھ لی تھیں، جو اس موضوع پر بنیادی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے مجھے پوری طرح اطمینان ہوا کہ جملہ نفسیاتی مسائل میں مسلم نفسیات کا طریقہ علاج ہی مؤثر اور کامل شفا بخش علاج ہے، اس سلسلہ میں مغربی نفسیات، مسلم نفسیات کے مقابلہ میں کوسوں دور ہے۔

تصوف کے مختلف سلسلوں نے سالکوں کی نفس کی اصلاح کے لئے جو روحانی مشقیں متعین کی ہیں یا مراقبہ جات تجویز کئے ہیں، ڈاکٹر صاحب ان مشقوں کا عملی تجربہ رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان ساری مشقوں کا ہدف ایک ہی ہے کہ نفس کی خرابیوں کی اصلاح کی جائے، نفس کی قوتوں کو پامال کیا جائے اور نفس کو مفتوح کیا جائے، تاکہ اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہو اور اخلاق حسنہ کی استعداد پیدا ہو۔ تصوف کے مراقبہ جات اور مشقوں کا مقصد یہی ہے۔ جو طالب بھی اہل اللہ کی معیت میں ذکر فکر کے مجاہدے کرے گا اسے انشاء اللہ یہ مقصد حاصل ہوکر رہے گا۔

تصوف میں موجود خرابیوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ جو ہماری نظر میں بڑی حد تک صحیح ہے یہ ہے کہ اس کا ایک بڑا سبب فنائے نفس کے مقام تک رسائی حاصل ہونے سے پہلے کشف، القا اور تصرفات کا حاصل ہونا، وقت سے پہلے بزرگی کی

مسند پر فائز ہونا اور خلافت کا عطا ہونا، اپنے مجاہدوں پر ناز کا ہونا، عملیات کی صلاحیتوں کا ہونا، اور مجاہدوں کے نتیجہ میں اس آرزو کا ہونا کہ بزرگ بن کر دوسروں کی اصلاح شروع کردی جائے۔ بہتر علمی اور ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے چونکہ ایسے افراد کی طرف لوگوں کا آسانی سے رجوع ہوتا ہے، اس لئے وہ دعویٰ کی راہ پر گامزن ہوجاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں انہیں جو سزا ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ دولت کا رخ ان کی طرف کردیا جاتا ہے۔ جب دولت آتی ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر مالداروں اور دولت مندوں کی طرز معشیت وطرز معاشرت ازخود آنا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ سب نتیجہ ہوتا ہے، صبر کے ساتھ غیر معمولی مجاہدوں کے عمل سے گزرے بغیر بزرگ بننے کی آرزو کے ہونے کا۔ حقیقی اہل اللہ اس سزا کے ملنے سے کانپتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ دعویٰ اور وافر دولت سے اللہ کی پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ وہ بزرگ بننے کے جذبات سرے سے رکھتے ہی نہیں، ان کی سب سے بڑی آرزو ہی یہی ہوتی ہے کہ ان کی اپنی اصلاح ہوجائے تو یہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

اس عاجز کی طرف بعض نفسیاتی مریض بھی رجوع ہوتے ہیں، جو ڈپریشن کی آخری حدوں کو چھوچکے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے مراقبہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ وہ علمی اور عقلی طور پر مسلم نفسیات کے اس طریقہ علاج کو سمجھنا چاہتے ہیں، ایسے قابل رحم مریضوں کو میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ محترم ڈاکٹر محمد طاہر صاحب سے موبائل کے ذریعہ رابطہ رکھیں، وہ انشاء اللہ آپ کو ذہنی طور پر ہر طریقہ سے مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے۔ الحمداللہ ایسے مریض ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوتے ہیں، اس کے بعد اس سلسلہ میں وہ مطمئن ہوجاتے ہیں اور انہیں غیر معمولی طور پر فائدہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں اللہ کی بے کس مخلوق کے لئے بے غرضانہ طور پر اتنا وقت نکالنا کہ اشتعال میں آئے بغیر گھنٹوں ان کی باتیں سننا اور حکمت کے ساتھ انہیں مطمئن کرنا، ڈاکٹر صاحب کی یہ خدمت انشاء اللہ عنداللہ مقبول ہوگی اور ان کے لئے سعادت دارین کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

متوسط صوفی اسلام کی مظلومیت، مسلمانوں کی حالت زار اور غریبوں کی بے کسی

پر غیر معمولی طور پر بے چین ہوجاتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے کردار کی ادائیگی کے لئے بہت زیادہ فکرمند ہوتا ہے۔ اس کی یہ بے چینی قابل داد ضرور ہوتی ہے، چونکہ اس کا نفس حالت سفر اور مدوجز میں ہوتا ہے، اس لئے متوسط صوفی کو اپنے ان جذبات کو حداعتدال میں رکھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بھی اس معاملہ میں فکرمندی بعض اوقات حد سے تجاوز کرجاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی ادا جو ہمارے جدید باصلاحیت اور ذھین افراد اور مختلف شعبوں سے وابستہ ماہروں کے لئے قابل تقلید ہے، وہ حب مال سے آزاد ہوکر اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا ہے۔ اس وقت باصلاحیت فرد دنیا پر اس قدر ٹوٹ پڑا ہے کہ اسے ہوش ہی نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کو دنیا کمانے کے سارے مواقع میسر ہیں اور پیشہ وارانہ صلاحیت کے معاملے میں بہت کم افراد ہیں، جو ان جیسی صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ لیکن انہوں نے ان صلاحیتوں کو دنیا کے مٹی کے ڈھیر جمع کرنے میں صرف کرنے کے بجائے فقر محمدی کی راہ اختیار کی ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر صاحب اپنی علمی و ذہنی صلاحیتوں او ر راہ سلوک کے مجاہدوں کی وجہ سے ایک بڑے خطرے سے بھی دوچار ہیں، یہ دعویٰ کا خطرہ ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کا خطرح ہے۔ طالب فنائے کامل کے مقام تک رسائی سے پہلے مسلسل اس خطرہ سے دوچار رہتا ہے۔ اس لئے زندگی کے ہر موڑ پر خود احتسابی کی ضرورت ہے، اگر نفس کا سانپ کروٹ لے اور دعویٰ کی راہ پر اکسانے کی لئے کوشاں ہو تو نفس کو پامال کرنے کے لئے مزید مجاہدے کرنے چاہیے، نفس کا یہ درندہ آسانی سے مطیع ہونے والا نہیں ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو استقامت نصیب فرمائے اور ہر قسم کے فتنوں سے آخر وقت تک حفاظت فرما کر، ایمان کی سلامتی کے ساتھ قائم رکھے اور رخصت فرمائے۔

مفتی محمد طیب

مفتی محمد طیب صاحب عالم دین ہیں، صوفی ہیں، بہتر ذہنی صلاحیتوں کے حامل ہیں، عمر کوئی ۳۲ سال کے لگ بھگ ہوگی، اس عمر میں موصوف اپنے متوسلیں کا کافی حلقہ تیار کرکے، انہیں راہ سلوک میں چلانے میں کامیاب ہوئے ہیں، جو ان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی غماز ہے۔ نوجوان عالم، جب تصوف کی ریاضتوں کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کا کام ہاتھ میں لیں تو یہ ایک اعتبار سے ہمارے بہتر مستقبل کی علامت ہے۔

مفتی محمد طیب صاحب دارالعلوم کراچی کے فارغ تحصیل ہیں، ان کی بیشتر تعلیم وتربیت دارالعلوم میں ہی ہوئی ہے، دارالعلوم کراچی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ طلبہ میں امت پن کا تصور راسخ کرتے ہیں اور انہیں گروہی اور مسلکی تعصّبات سے اوپر اٹھاکر امت پن کی حیثیت سے ان کی ذہن سازی کرتے ہیں۔ دارالعلوم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ طلبہ میں فکری وسعت اور ذہنی طور پر توازن پیدا کرتے ہیں، جس کی اس وقت ہمارے معاشرے کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

دارالعلوم کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ طلبہ کو جدید فتنوں سے بھی آشنا کیا جاتا ہے۔مفتی محمد طیب صاحب میں دارالعلوم کی یہ ساری خصوصیات موجود ہیں۔

مفتی صاحب، مولانا احسان الحق صاحب (جو ان کے قریبی عزیز ہیں) کی ایما پر تعلیم کے آخری سالوں میں مجھ سے ملنے آئے توان کی ذہانت دیکھ کر خوشی ہوئی۔

تعلیم سے فارغ ہوکر موصوف مولانا احسان الحق صاحب کی ہدایت پر حضرت مولانا عبدالحی صاحب سے بیعت ہوئے، بیعت کے بعد ان کے ذکر وفکر کے مجاہدوں کا عمل شروع ہوا، مکہ ومدینہ کے سفر کے دوراں انہوں نے حضرت مولانا عبدالحیؒ کی غیر معمولی خدمت بھی کی، اس طرح وہ مولانا کی خصوصی دعاؤں وتوجہات کا موجب بنے، پانچ سات سال کے مجاہدوں کے دوران ہی انہیں خلافت عطا ہوئی، اور موصوف

نے کوئٹہ میں شریعت وطریقت کی ترویج کا کام شروع کردیا، کوئٹہ میں انہیں جلد ہی مرکزی مسجد میں خطابت وامامت کے مواقع بھی ملے۔ کوئٹہ میں مولانا احسان الحق صاحب کے مریدوں کا کافی حلقہ موجود تھا، مولانا نے ان کی تربیت کا کام بھی مفتی صاحب کے حوالے کیا۔

ذکر وفکر اور مراقبہ جات کی مشقوں کی وجہ سے مفتی صاحب کو جلد ہی کشف والہام بھی ہونے لگا اور ارواح سے روابط کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، کشف والقا ویسے تو انعام کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس سے سالک اور صوفی کی حوصلہ افزائی مقصود ہوتی ہے کہ ہمیں تمہارے مجاہدے قبول ہیں۔ جب کشف والقا شہرت کا ذریعہ بن جائیں تو وہ ابتلا وآزمائش کی صورت اختیار کرجاتے ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ فنائے کامل (یعنی نفس مطمئنہ) تک رسائی سے پہلے کشف والقا وتصرفات سالک کے لئے امتحان بن جاتے ہیں، اس لئے کہ اس سے سالک میں دعویٰ کی ایک صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

اس عاجز کو ایسے متعدد سالکوں یا صوفیوں سے واسطہ ہوا ہے، جو کشف والقا کو اپنے مریدوں میں اضافہ، اپنی شہرت اور دولت کا ذریعہ بنانے کے لئے کوشاں رہے ہیں، اس لئے اکابر بزرگان دین کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ سالکوں کو دس پندرہ سال کے شب وروز کے غیر معمولی مجاہدوں سے پہلے خلافت دینے کے روادار نہیں تھے، خلافت کے بارے میں بزرگان دین کے اس معمول میں بڑی حکمتیں پوشیدہ رہی ہیں کہ اس سے ایک تو سالک کو نفس کی غیر معمولی قوتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے، ان مشاہداتی مراحل سے گزرنے کے بعد طالبوں کی نفسی تربیت میں انہیں آسانی ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ سالکوں میں دعویٰ کی نفسیات کی بڑی حد تک نفی، فنائے کامل کے بعد ہی ہوتی ہے، اس سے پہلے خلافت سالکوں کے لئے بہت بڑا امتحان بن جاتی ہے۔

موجودہ دور میں بعض بزرگوں پر معاشرے کو دینی اعتبار سے سنبھالنے کا پہلو غالب رہا ہے، اس لئے ان کی طرف سے سرسری مجاہدوں کے بعد خلافت دے کر، افراد کو دوسروں کی تربیت کے کام پر لگا دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں سلف کے معمولات میں ترمیم

کی وجہ سے یقیناً دعوتی طور پر ایک اعتبار سے فائدہ ہی ہوا ہے۔ لیکن اس کا یہ نقصان دہ پہلو بھی ظاہر ہوا ہے کہ قبل از وقت خلافت سے بالخصوص کشف حاصل ہونے اور مرید ملنے کے بعد سالک دعویٰ کی راہ پر گامزن ہونے لگا ہے، جس سے ایک تو وہ خود اپنی نفسی قوتوں کے زیر وزبر ہوتا رہا ہے۔ دوم یہ کہ اس سے تصوف، جو معاشرہ میں پہلے ہی متنازع تھا، وہ مزید متنازع ہوتا جارہا ہے ۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے بزرگوں پر یہ جذبہ غالب ہوتا ہے کہ کسی طرح مریدوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے، اگر ارواح سے ملاقات کا فن حاصل ہوگیا تو اپنے خاص مریدوں کو اس کام پر لگا دیا جاتا ہے، اس طرح معاشرہ میں یہ مرید بزرگ کی مزید شہرت کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور دوسرے بزرگوں کے متوسلین کو کاٹ کر، اپنے حلقہ میں شامل کرنے کی کاوش شروع ہوجاتی ہے، اس طرح تصوف وسلوک کے نام پر معاشرہ میں ایک طرح کی کشیدگی شروع ہوجاتی ہے، یہ عاجز چونکہ طویل عرصہ تک نفسی قوتوں کے مشاہداتی مراحل سے گزرا ہے، اس لئے الحمداللہ اس عاجز کو نفسی قوتوں کے بیشتر مکر وفریب کی واردات کا مشاہدہ ہوا ہے اور مزید ہوتا جا رہا ہے، متعدد بزرگوں کی طرف سے اجازت ملنے کے باوجود یہ عاجز دوسروں کو بیعت کرنے سے معذرت کا اظہار کرتا ہے، ان کے اصرار پر یہ عرض کرتا ہے کہ اگر ان میں اصلاح کی حقیقی طلب موجود ہے تو وہ ہمارے حلقہ میں شریک ہوتا رہے اور رابطہ رکھنے کی کوشش کرتا رہے، یہ عاجز یہ احتیاط اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ بیعت کرنے سے کہیں نفس بزرگ بننے کی خبط میں مبتلا نہ کردے۔

ایک صاحب جو نوعمر ہیں اور موصوف کے مجاہدوں کا دورانیہ بھی کوئی زیادہ نہیں ہے، موصوف نے مجھے دعوت دی کہ وہ ان کے ساتھ مراقبہ کرے تو ان پر ازخود اپنے حالات منکشف ہوں گے، موصوف زندگی بھر مجاہدے کرنے والوں کو اس طرح کی دعوت دیتے رہے ہیں، اس دعوت کا نتیجہ نفس کے موٹے ہونے اور دعویٰ کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر رہ سکے، مشکل ہے۔

یہ بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ کشف عام افراد کے لئے غیر معمولی چیز ہے اور وہ اسے تصوف کا ہدف سمجھتے ہیں، اس لئے کشف کے حامل افراد کی طرف رجوع زیادہ ہوتا ہے،

اگر انہیں دوچار متحرک اور باصلاحیت افراد مل جائیں تو وہ اپنے بزرگ کے لئے فضا ہموار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، اس طرح، صاحب کشف بزرگ متحرک مریدوں کی وجہ سے مزید امتحان وآزمائش میں مبتلا ہوجاتا ہے، حالانکہ کشف والقا، تصرفات اور ارواح کے مشاہدے نہ تو تصوف کے مقاصد میں شامل ہیں اور نہ ہی اس کے لوازمات میں، بلکہ یہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کا ذیلی نتیجہ ہوتے ہیں، ایک مرید نے حضرت مجددؒ کو لکھا کہ مجھے یہ بڑی سعادت حاصل ہے کہ بزرگ ارواح سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، آپ نے اسے لکھا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ ارواح کی ملاقات کو اہمیت نہ دو، اس لئے کہ یہ بزرگوں کے لطائف کی شکلیں ہوتی ہیں۔

دوسرے مکتوب میں حضرت مجددؒ لکھتے ہیں کہ میں کشف والہام کو جَو کے دانے کے بدلہ خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جس کشف والہام کی بزرگوں کی نظر میں یہ اہمیت ہو، اسے فیصلہ کن اہمیت دے کر مریدوں میں اضافہ اور دعویٰ کی راہ پر گامزن ہونا بڑے خسارہ کا سودا ہے۔

اکابر بزرگوں نے حجابات نورانی، جو کشف وتصرفات وغیرہ کی صورت میں ہوتے ہیں، انہیں حجابات ظاہری سے زیادہ سخت اور زیادہ نقصان دہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ حجابات نورانی اکثر سالکوں کو بزرگی کی دعویٰ کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، ہمارے ایک خلافت یافتہ دوست ہیں، جب انہیں کشف ہونے لگا اور ارواح سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو انہوں نے اپنے بزرگ سے اس کا ذکر کیا تو بزرگ موصوف نے کہا کہ اس کو اہمیت نہ دو، اور کشف ہونے لگے تو اس کی طرف متوجہ نہ ہو، لیکن موصوف نے بزرگ کی اس ہدایت کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور فرمایا کہ مجھے روحانی طور پر جن مشاہدات کی سعادت حاصل ہے، میرے مرشد کو اس کا ادراک نہیں، یعنی میرے مرشد اس روحانی سیر وسفر سے آشنا نہیں، جو مرید اپنے مرشد کے بارے میں اس طرح کا نقطہ نگاہ رکھتا ہو، اکابر بزرگوں کی تصریحات کے مطابق ایسے مرید کو نورانی حجابات کی صورت میں شدید آزمائشوں اور فتنوں میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔

ایک نوجوان بزرگ ہیں، جو اپنے کشف کو برحق سمجھ کر اپنے مریدوں کو اس کام کی

طرف متوجہ کررہے ہیں کہ دجال کا ظہور ہونے والا ہے، دجال کے مقابلے کا کام اس کے سپرد ہوا ہے، دجال کا مقابلہ تیروں سے ہوگا، اس لئے تمہیں تیر مارنے میں ملکہ حاصل کرنا چاہیے، مرید صاحبان، موصوف کے اس کشف کو صحیح سمجھ کر اس کام میں مصروف ہیں۔

دراصل اس طرح کے کشف بعض اوقات صفاتی اسماء کے ذکر وتکرار کا نتیجہ بھی ہوتے ہیں۔

اس طرح کے ایک کشف کا ذکر حضرت نثار احمد خان فتحیؒ نے اپنی کتاب ظہور مہدی اور ہمارے اندازے اور پیشگوئیاں میں لکھا ہے کہ ایک صاحب نے مکہ مکرمہ میں امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، ان کے بعض مرید جو ان کے تقویٰ، زہد اور للّٰہیت کی وجہ سے ان کی بزرگی کے تو پورے قائل تھے، لیکن ان کے اس دعویٰ کے بارے میں متردد تھے، انہوں نے حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ آپ مجھے اپنے مرشد کے پاس لے چلیں، تاکہ صحیح حالات معلوم ہوجائیں، مریدوں نے اپنے مرشد سے اس کا ذکر کیا، اس طرح حاجی صاحب ان کے پاس تشریف لے آئے، دونوں نے ملکر مراقبہ کیا، مراقبہ کے بعد حاجی صاحب نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بعض مرید کہتے ہیں کہ آپ امام مہدی ہونے کی بات کرتے ہیں، کیا یہ بات صحیح ہے، مرشد نے کہا نہیں، میں اس طرح کا دعویٰ کہاں کرتا ہوں، بعد میں ان مرشد کے مریدوں نے حاجی صاحب سے پوچھا تو حاجی صاحب نے فرمایا کہ یہ اسم ہادی کی سیر میں کھوئے ہوئے تھے، یہ دعویٰ اس کا نتیجہ تھا، میں نے مراقبہ میں توجہ دے کر اسے اس حالت سے نکال دیا، جس کی وجہ سے ان کے اس دعویٰ کی نفسیات ختم ہوئی۔

دراصل کشف والہام کے ذریعہ اس طرح کے دعویٰ بالواسطہ طور پر معاشرہ کو تصوف و اہل تصوف سے دور کرنے اور اپنے مریدوں کو غلط راہ پر گامزن کرنے کا موجب بن جاتے ہیں، جن سے بچنے کی ضرورت ہے۔

(۲)

تصوف میں شامل نوجوان شخصیت (جس پر کشف کی راہ کھل گئی ہو) کی طرف سے تحریری صورت میں یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت مجدد الف ثانی کے جو معارف مجھے حاصل ہیں،

وہ اب تک کسی دوسری شخصیت کو حاصل نہ ہو سکے۔ یہ دعویٰ بڑے خطرہ کی بات ہے، چونکہ ایسی شخصیت اپنے معارف وباطنی مشاہدات کے حوالے سے اپنے مرشد کو ہیچ سمجھنے لگتی ہے، اس لئے اس طرح کی شخصیت کے دعویٰ سے بچنے کے سارے راستہ مسدود ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کی دعواؤں سے مرید تو زیادہ مل سکتے ہیں اور معاشرہ میں بزرگانہ حیثیت بھی مستحکم ہوسکتی ہے، لیکن سلف کی عاجزی وفنائیت کی راہ گم ہوجاتی ہے اور ایسی شخصیت، نورانی حجابات کے ذریعہ اپنے مریدوں میں بھی بالواسطہ طور پر دعویٰ کے جراثیم منتقل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

بہت زیادہ سنبھلنے اور خوداحتسابی کی ضرورت ہے۔ طویل عرصہ تک کسی اہل اللہ کے سامنے اپنے آپ کو پامال کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مجدد کے جن معارف و مشاہدات کا دعویٰ کیا جاتا ہے، حضرت مجدد نے خود فرمایا ہے کہ کشف والقا اور دوسری دنیا کے مشاہدات کی حیثیت راہ سلوک کے طالبوں کے لیے دل بہلانے کے کھلونوں سے زیادہ نہیں۔

عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اہل تصوف کے اس طرح کے حالات دیکھکر ہی فرمایا تھا کہ اسلام کو اہل تصوف سے جو نقصان پہنچا ہے، اتنا نقصان کسی اور چیز سے نہیں پہنچا۔''

اس لئے بزرگی کی مسند پر فائز ہوکر اپنے غیر مرئی واقعات اور کشف والقا کو فیصلہ کن اہمیت سے پیش کرنا، اسے معراج کمال سمجھنا، اور مریدوں کی اسی بنیاد پر ذہن سازی کرنا یہ گویا وحی اور اسلامی شریعت کے بالمقابل نئی شریعت تخلیق دینا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب فنائے کامل (جسے نفس مطمئنہ اور قلب سلیم کی مستحکم حالت بھی کہہ سکتے ہیں) تک رسائی سے پہلے فرد پر کشف کی راہ کھل جاتی ہے تو وہ آزمائش میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، ایسا فرد اگر بزرگی کے مقام پر بھی فائز ہوجائے تو اس کی ابتلا وآزمائش میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ فنائے کامل تک رسائی سے پہلے دعویٰ کے بت سے پوری طرح نجات کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی، اس طرح کی شخصیت کے لئے بہتر لائحہ عمل یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا چاہئے کہ وہ بزرگی اور دوسروں کی تربیت کے مقام سے دستکش ہوکر گوشہ نشین ہوجائے، تاکہ اس کے کشف والقا ومشاہدات کی باتوں کی تشہیر سے

اس کے متعلقین میں اسلامی شریعت سے متوازی شریعت کے لئے فضا ہموار نہ ہو سکے۔

تصوف کی ریاضتوں ومجاہدوں کا تو مقصود ہی افراد کو غیراللہ سے ہٹاکر اللہ سے ان کے متعلق کو مستحکم کرنا ہے اور اسلامی شریعت پر استقامت سے گامزن ہونا ہے۔ جس تصوف کا مقصود ہی یہی ہو، اس تصوف کو دوسری دنیا کے سیر وسفر اور مشاہدات کا ذریعہ بنانا اور اپنے مرسیدوں کو بھی اس راہ پر گامزن کرنا، یہ دراصل غیر اللہ میں مصروف ہونے کے مترادف ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی شخصیت پر مضمون میں تلخی اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ موصوف، زندگی بھر ذکر ومراقبہ کو وظیفہ بنانے والی عمرہ رسیدہ شخصیتوں کو بھی دعوت دیتے رہتے ہیں کہ وہ اگر ان کے ساتھ مراقبہ کریں گے تو ان پر اپنے حالات منکشف ہوجائیں گے۔

بہرحال اس تلخی کے لئے یہ عاجز مفتی صاحب سے دل کی گہرائیوں سے معافی کا خواہاں ہے، مقصود خیر خواہی ہے اور نو عمر شخصیت کو اپنے زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات اور حاصل مطالعہ سے آشنا کرکے، سلف کی لائین اختیار کرنے اور اپنے روحانی مشاہدات پر مصر ہونے اور ان مشاہدات کی بنیاد پر اپنے مریدوں کی ذہن سازی کرنے کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔

یہ عاجز اپنے تلخ اسلوب بیان کے لئے خود اپنے سامنے بھی شرمندہ ہے، اس لئے کہ اہل تصوف کے ہاں سب کے لئے محبت ہی محبت ہوتی ہے۔ تنقید میں بھی جذبات محبت ہی شامل اور غالب ہوتے ہیں۔

مفتی صاحب سے امید ہے کہ وہ ہماری معروضات پر کسی اور اعتبار سے نہیں تو کم از کم اس اعتبار سے ضرور غور وفکر فرمائیں گے کہ ان کے مرشد کے حلقہ کے عمر رسیدہ فرد (جن پر انہیں مکمل اعتماد تھا، اور جن کی مرتب کردہ بعض کتابوں کو حضرت موصوف مسلسل زیر مطالعہ رکھتے تھے) یہ ان کی دل کی گہرائیوں اور دردمندی وفکر مندی سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح کی صورت پیدا فرمائے اور ہمیں سلف صالحین کی راہ پر گامزن فرمائے، جس کی دعا ہم **اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم** کی صورت میں ہر نماز میں کرتے ہیں۔